آدھی چادر
رضیہ اسماعیل

آدھی چادر

آدھی چادر

افسانے

رضیہ اسماعیل

BOOK HOME

آدھی چادر

رضیہ اسماعیل

اہتمام	رانا عبدالرحمن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2016ء
قیمت	600 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور
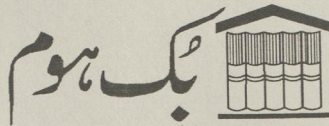
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون:042-37231518-37245072 فیکس:042-37310854
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

انتساب اوّل

امی کے لیے

جن کی بے لوث محبتوں اور نورانی دعاؤں کی ردا نے
مجھے موسموں کی شدتوں سے محفوظ و مامون رکھا

انتساب ثانی

ثناؔ اور وردہ کے لیے

جو میرے وجود کا جواز ہیں اور جن کی موجودگی
میرے ہونے کی آدھی نہیں بلکہ پوری گواہی دے رہی ہے

حسنِ ترتیب

پیش کلام

نہایت متبرک ساعتوں میں معرضِ وجود میں آنے والی مملکتِ خداداد پاکستان کی اس نسل سے میرا تعلق ہے، جس کا جنم بٹوارے کے چند سالوں بعد ہوا۔ میں ایک ایسی نسل کی وارث ہوں جسے لوریوں کی جگہ ہجرت کی خونچکاں داستانیں سُننا پڑیں۔ بے خانماں، بے سروسامان، زخم خوردہ، شکستہ پا، مگر آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے خواب سجائے، حوصلوں کی جولانیوں سے آباد دلوں کے ساتھ، میرے آباؤاجداد جن گھروں میں اترے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہاں پوجا پاٹ کے لیے بنے ہوئے استھانوں سے ہم نے خود مورتیاں ہٹائیں۔ طاق میں رکھے ہوئے دیوالی کے دیئے کے دھوئیں سے سیاہ ہونے والی دیواروں کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

رام چندر، سیتا، راون، اورستی کے جلوس کی کہانیاں ہمیں نصاب میں پڑھنے کو ملیں۔ دسہرا، بیساکھی، دیوالی، بنارس، کاشی اور متھرا کی اندھی عقیدتوں کے قصے ہمیں ازبر کرائے گئے۔

ہماری زمانے کے سرد و گرم سے ناچشیدہ آنکھوں میں تعبیر و تعمیر پاکستان کے خوابوں کی فصل بوئی گئی۔ خوابوں کے بوجھ سے دم توڑتی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ ہم فضاؤں میں جیسے تیر رہے تھے۔ خوابوں کا فسوں ایسا تھا کہ جیسے اندر سے آواز آ رہی ہو:

خواب گر ہوں

مرے کانچ کے خواب ہیں

چوڑیوں کی بجائے سجالو

مرے خواب بانہوں میں تم

خواب پہنو مرے، خواب اوڑھو مرے

میں بھی تن پہ سجائے قبا خواب کی

حالتِ خواب میں چل رہی ہوں

نئی منزلوں کی طرف

راستے میں مرے کوئی کانٹا نہیں

خواب کی فصل ہے لہلہاتی ہوئی

خوش نما خواب رستوں میں لٹکے ہوئے

ٹہنیوں پہ کہیں خواب اٹکے ہوئے

راستہ نیند میں جیسے بھٹکے ہوئے

خواب آنکھوں کی بانہوں میں سوئے ہوئے

خواب خوابوں کے من میں سموئے ہوئے۔۔۔

پتہ ہی نہ چلا کب خوابوں کی فصل کانٹوں میں تبدیل ہو گئی۔ خواب ٹوٹنے لگے، خواب بکھرنے لگے، ان بدنصیب آنکھوں نے پاکستان کو ٹوٹتے اور خوابوں کو دربدر ہوتے ہوئے دیکھا۔ دو قومی نظریے کی دھجیاں بکھرتی اور خلیج بنگال میں ڈوبتی ہوئی دیکھیں۔ ایسے میں میرے خواب مستقل اداسی کی ردا اوڑھ کر جیسے تھک کر سو گئے ہوں سو تب سے میں ایک اداس نسل کی بے حد اداس فرد ہوں۔

پھر میرے پرکھوں کی طرح میرے مقدر میں بھی ہجرت لکھ دی گئی۔ لیکن ان

کی جبری ہجرت کے برعکس میری ہجرت اختیاری تھی سو میں اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے پچھلے چالیس برس سے زائد عرصے سے اپنے نئے وطن (برطانیہ) میں مقیم ہوں۔

اب جب کہ زندگی کی دوپہر ڈھل رہی ہے۔ سورج کی تمازت رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی ہے۔ افق پہ لالی اپنے خیمے گاڑ رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سارا منظر جیسے کُھلنے لگتا ہے۔ سوچتی ہوں یہودی ہولوکوسٹ پر گریہ زاری کرتے نہیں تھکتے مگر پنجاب کے ہولوکوسٹ کی کہانی کب لکھی جائے گی؟ اس کا نوحہ کون لکھے گا؟ پنجاب کے ہولوکوسٹ کے میوزیم کب بنیں گے؟ کب بین الاقوامی قوانین اس بات کا اقرار کریں گے کہ پنجاب پر کیا بیتی؟ اس کے نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ پنجاب اور پنجابیوں کی تقدیر کا فیصلہ کیوں ان پہ چھوڑ دیا گیا جن کا پنجاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا؟ اس آدھی پونی غیر منصفانہ تقسیم سے بلند ہونے والے شعلے کب سرد ہوں گے؟ کالی سیاہی سے نقشے پہ کھینچی ہوئی لکیر کب اور کیسے خونی لکیر بن گئی؟ انسان کب انسانیت کا چولا اتار کر وحشی بن گیا؟ بے شمار سوالات ہیں مگر وقت کی اندھی گھپاؤں سے کوئی جواب نہ پا کر یہی کہنا پڑتا ہے:

تیرے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

کیا صرف ایک امرتا پریتم کے وارث شاہ کو دہائیاں دے دے کر قبروں سے بلانے پر پنجاب کے زخموں کا مداوا ہو گیا؟

اس کتاب کا محرک بننے والا افسانہ ''آدھی چادر'' بھی پنجاب اور پنجابیوں کی حرماں نصیبیوں کی داستان ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے واہگہ اٹاری بارڈر پر میرے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔ یہاں قلم بند کی جانے والی کئی کہانیوں میں بٹوارے کی تلخیاں

سانس لے رہی ہیں جن میں آدھی چادر کے علاوہ ہرنام داس، باکا اور چیچہ وطنی شامل ہیں۔

مجھے اپنے افسانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے کیونکہ یہ محض افسانے نہیں ہیں میرے اندر کا شور ہے جس نے بہت عرصے سے میرے اندر ایک اُدھم مچایا ہوا تھا۔ اب کاغذی پیرہن سے لپٹ کر ممکن ہے اسے کچھ قرار آ گیا ہو۔ میرا ماننا ہے کہ جب تک یہ کہانیاں باہر نہ آتیں۔ دوسری اَن گنت کہانیوں کو راستہ ملنا دشوار تھا۔ اب جبکہ بارش کے پہلے قطرے کی مانند یہ کہانیاں کاغذ کی سجل دھرتی پر برس گئی ہیں تو امید ہے کہ سالہا سال سے منتظر اور بہت سی کہانیوں کی رم جھم جلد ہی صفحۂ قرطاس کو شرابور کر دے گی۔

آپ انھیں پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کیونکہ

مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید

رضیہ اسماعیل

16 مارچ 2016ء

''آدھی چادر'' کے افسانے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل، نظم، ماہیا، دوہے، وغیرہ) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔ تنقیدی و تعارفی مضامین اور طنز و مزاح پر مشتمل تحریریں وہ ایک عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، پھر ان کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والا کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے''۔ یہ ساری شعری و نثری نگارشات میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آرہا ہوں۔ اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس کی ان پیج فائل میرے سامنے ہے۔ میں اس مجموعہ کے سارے افسانے پڑھ چکا ہوں اور اب ان کے بارے اپنی رائے دے سکتا ہوں۔ پہلے میں ترتیب وار ہر افسانے کا ممکنہ اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا اور آخر میں سارے افسانوں پر اپنی مجموعی رائے بیان کردوں گا۔

''روشنی کا تعاقب'' صوفیانہ خیالات سے لبریز انسان کی خارجی خباثتوں اور داخلی خوبصورتیوں کی دلچسپ کہانی ہے۔ فرانز کافکا کی کہانی کی طرح رضیہ اسماعیل مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کے عمل سے ایسے گزرتی ہیں کہ خود دیکھنے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی مٹھی بھر زندگی قریب سے دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی زندگی جہاں بہت سارے کہے اور ان کہے سوال ہیں اور سوالوں کے اندر ہی کہیں ان کے جوابوں کی روشنی

بھی ہے۔

’’کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔‘‘ (روشنی کا تعاقب)

’’ہرنام داس‘‘ تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے المیہ کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کہانی کار نے اپنے بچپن کی عمر کی سوچ کو جس طرح اظہار کی زبان دی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ ایسے ایسے معصومانہ سوال جن کے عقب میں زندگی کی مکاریوں کے کتنے راز چھپے ہوئے ہیں۔

’’بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!‘‘ (ہرنام داس)

ہرنام داس کے نام کے سحر میں کھوئی معصوم بچی پر جب اپنے والدین کے دکھوں کا راز کھلتا ہے تو تقسیم کے انسانی المیہ کی دوطرفہ المنا کی مزید دکھی کرنے لگتی ہے۔

’’یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔‘‘ (ہرنام داس)

’’سوری‘‘ ویسے تو انگلینڈ میں زندگی گزارنے والوں کی ہلکی پھلکی سی روداد ہے لیکن اس کے پس منظر سے عراق پر امریکی و برطانوی حملہ کا المیہ ابھرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں سلمان اور سوسن کو اپنا کالج کے زمانے کا جیک یاد آتا ہے۔ بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والا جیک فوج میں چلا گیا تھا اور اسے عراق جنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر پاگل ہو چکا تھا۔ ایک پرانے دوست کا طویل عرصہ کے بعد سامنے آنا اور وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔ لیکن کہانی کے مرکزی کردار کو احساس ہوتا ہے کہ عراق پر ہونے والے بے جا حملے میں

شریک ہوکر جیک کا دیوانہ پن درحقیقت اس کا احساسِ گناہ ہے اور اس احساس کے حوالے سے وہ کہانی کے آخر میں کہتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔'' (سوری)

''چھنال'' پہلے دیپک کی ماں ساوتری کی زندگی کی اور پھر دیپک اور جیوتی کی زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں گھریلو زندگی اور ہندوستانی دیہاتوں کا پرانا سماج مثالی مشرقی ماحول کی تصویر پیش کررہا ہے۔

''مکئی کا دانہ'' پاکستانی دیہاتوں کے عمومی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔گاؤں کا نمبردار اپنی جاگیر کے زعم میں گاؤں میں محض اس لیے ہسپتال بننے نہیں دیتا کہ گاؤں کے کمی کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔اولادِ نرینہ سے محروم جاگیردار کے ہاں ایک مدت کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے،لیکن شومیٔ قسمت بڑی بہن اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے منہ میں مکئی کا دانہ ڈال دیتی ہے جو بچے کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔گاؤں کے کمپوڈر سے بچہ ٹھیک نہیں ہوتا۔آخر شہر سے اسی کمی کے بیٹے ڈاکٹر عباس کو بلایا جاتا ہے۔وہ بچے کو اُلٹا کرکے کمر پر ہاتھ مارتا ہے تو مکئی کا دانہ باہر آجاتا ہے۔لیکن بچہ تو کبھی کا مر چکا تھا۔گاؤں کے نمبردار کا وارث دم توڑ چکا تھا اور نمبردار کی رعونت خاک میں مل چکی تھی۔

لُک چھپ جانا

مکئی دادانہ

راجے دی بیٹی

آئی جے......لُک چھپ جانا......

کے الفاظ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔آج ایک مکئی کے

دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے ککھ کر دیا تھا۔

ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی......نہ زمانہ رہا......اور نہ ہی کائنات۔ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام ونشان کر دیا تھا۔''

(مکئی کا دانہ)

''دیوارگریہ'' ایک خوبصورت لڑکی کی دکھ بھری داستان۔خواتین کے جذبات کی عمومی کہانی۔تاہم اس میں عمومیت کے باوجود کچھ خاص محسوس ہوتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی ؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔ بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔''

(دیوار گریہ)

''چیچہ وطنی'' پرانے دیہاتی ماحول کی دلچسپ کہانی ہے۔بس ایک روداد سی تھی جسے رضیہ اسماعیل کے اندازِ بیان نے انہماک سے پڑھی جانے والی کہانی بنا دیا ہے۔

دو بیویوں کے شوہر محمد خان کی دوسری بیوی بن جانے والی فاطمہ جٹی سے پہلی ملاقات کا منظر دیکھئے۔

''اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ وسال بھی رک گئی...... لمحے سراسیمہ سے ہوگئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار گرتے گرتے بچا۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔ فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔‘‘(چیچہ وطنی)

’’کیہ جاناں میں کون‘‘ بظاہر ایک فرد کے رقص اور قونیہ میں مولانا روم کے پیروکاروں کے مخصوص صوفیانہ رقص کی منظر کشی سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔لیکن صوفیانہ رمزوں کے کئی اسرار کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھلاتی ہوئی یہ کہانی ایک ایسے ادھورے انسان کی المناک کہانی ہے جسے قدرت نے بناتے ہوئے مکمل نہیں کیا، آدھا، ادھورا رہنے دیا۔نہ مرد بنا، نہ عورت۔کہانی صوفیانہ ماحول سے باہر آتی ہے تو ادب کی فضا چھا جاتی ہے۔اس ادھورے انسان کی دلچسپیوں کا سلسلہ رقص، موسیقی، ادب اور فن کے دوسرے سلسلوں سے بھی کسی نہ کسی طور ملتا جاتا ہے۔دراصل یہ خاکہ نما افسانہ ہے جو افتخار نسیم (افتی نسیم) کی زندگی کی کچھ روداد بیان کرتا ہے اور کچھ افسانہ نگار کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانہ نگار کو افتی سے گہری ہمدردی ہے،لیکن افتی اپنی اضطراری حرکات سے ہر بار افسانہ نگار کو خود سے متنفر کر دیتا ہے۔اس کے باوجود افسانہ نگار کی

ہمدردی اس کے لیے کم نہیں ہوتی۔اس خاکہ نما کہانی کے اختتام کا یہ قدرے طویل اقتباس دیکھیں۔

''میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا:".It is for adults only"

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آکر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا ''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمھیں کیوں شک ہے؟''میں نے گویا جرح شروع کر دی۔اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہوسکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمھیں نابالغ سمجھتے ہوں۔''میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟''اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!''میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر،عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟''اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔رات بہت دیر تک جاگتے رہنے

کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔ جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا...... شاید اچھا ہی ہوا...... رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟'' میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے......

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔'' (کیہ جاناں میں کون)

''باکا'' غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کے دو دوستوں کی داستان ہے۔ کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان انڈونیشیا کی آزادی سے پہلے وہاں جاپانی فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ جاپانی فوجی وہاں جاسوسی کے شبہے میں پکڑے گئے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے اس کا حال جان کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض واقعات پڑھ کر تو انسان سوچنے لگتا ہے کہ پھر تو امریکہ کے پاس ایٹم بم گرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ کلکتہ کے خوش حال گھرانے کا ڈاکٹر یونس جاپانیوں کے مظالم کا شکار ہو کر پاگل ہو جاتا ہے۔ اس دوران پاکستان بن جاتا ہے اور ڈاکٹر یونس پاکستان کے کسی پاگل خانے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہیں اس کے دیرینہ دوست ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر علاج کے لیے اپنے گھر پر رکھ لیا۔ کہانی پڑھنے سے پہلے کہانی کا عنوان ''باکا'' پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے کہانی کے کسی کردار کا نام مبارک ہو گا لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زبان میں پاگل کو باکا کہتے ہیں۔

''آدھی چادر'' برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک نوحہ سا لکھا گیا ہے۔ اس میں مشترکہ انسانی قدروں کا ذکر بھی ہے اور شدید سماجی

تفاوت کا بیان بھی۔سماجی سطح پر باہم خیر اور بھلائی کے جذبات رکھنے کے باوجود سماجی تضادات کی کشمکش نے تقسیم کے موقعہ پر خونریزی کے المیہ کو جنم دیا۔ان ساری یادوں کو کہیں ادب کے حوالے سے، کہیں جذباتی رنگ میں، کہیں مذہبی شان کے ساتھ اور کہیں سادہ سے عام انسان کی طرح بیان کیا گیا ہے۔تاریخ کے کئی پہلو اس میں نظر انداز بھی ہوئے ہیں تاہم کہانی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے حال تک کو ایک نظر دیکھا گیا ہے اور اچھے مستقبل کی امید بھی کی گئی ہے۔

''ققنس''۔۔۔جیسے ''کیہ جاناں میں کون'' خاکہ نما افسانہ ہے ویسے ہی ''ققنس'' رپورتاژ نما افسانہ ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔جب کوئی لکھنے والا پختہ کار ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں مختلف اصناف کی آمیزش ایک خاص فنکارانہ مہارت کے ساتھ آسکتی ہے۔رضیہ اسماعیل کی بعض تخلیقات میں ایسا دیکھا جا سکتا ہے۔ ''ققنس''میں پہلے تو انگلینڈ کے بعض ادبی اداروں اور تنظیموں کا بالواسطہ تعارف کرایا جاتا ہے۔پھر بعض ادبی کرداروں سے ملوایا جاتا ہے۔مختلف ادبی موضوعات پر بحث کے لیے اچٹتے اشارے دیئے جاتے ہیں۔پھر ایک ادبی ورکشاپ کا حال سنایا جاتا ہے۔یہ سب کچھ ایک رپورتاژ کی صورت میں بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے اندر کے افسانہ نگار سے کام لیتے ہوئے اسے ایک افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

ایک پبلک لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے رضیہ اسماعیل بتاتی ہیں۔

''برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' (Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔'' (ققنس)

ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' کا نام بڑا خوشنما ہے۔لیکن ابھی تک کی

عملی سچی بات یہ ہے کہ تحریریں تو بارڈرز کو کراس کر سکتی ہیں لیکن رائٹرز کو بارڈرز کراس کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔خصوصاً انڈوپاک کے ادیبوں کو ویزے کی رکاوٹیں،دوسرے ملک میں مشکوک نظروں سے دیکھے جانے کی اذیتیں ایسی ہیں جو بارڈرز کی سخت اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہیں اور ادیب کی مجبوری کا بھی۔صرف انڈوپاک ہی میں نہیں اب تو مغربی دنیا میں آنے والوں کو بھی ویسی ہی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔اور لگ بھگ ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے۔سو رائٹرز ود آؤٹ بارڈرز محض کہنے کی بات ہے۔

ادبی ورکشاپ میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور ایک ترک رائٹر تک ان الفاظ میں پہنچتی ہے۔

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں...... موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں...... بین کرتی ہوئی کہانیاں...... روٹھی ہوئی کہانیاں...... ہاری ہوئی کہانیاں......مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں...... کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!'' اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔'' (ققنس)

''ققنس''میں بنیادی طور پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ جیسے ققنس اپنی آگ میں جل کر راکھ ہوتا ہے اور پھر اسی راکھ سے اس کا نیا جنم ہوتا ہے ویسے ہی جس کہانی کار کی کہانی مکمل نہیں ہوتی وہ پھر اپنی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔اور یوں کہانی کہنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔اس حوالے سے رضیہ اسماعیل نے ورکشاپ کے شرکاء کی مختلف آراء دینے کے ساتھ جوگندر پال کے ایک افسانچے کا اقتباس بھی دیا ہے۔

''ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔'' (ققنس)

اس کے بعد رضیہ اسماعیل نے جوگندر پال کے افسانچے کا ادھورا سا اقتباس دیا

ہے۔ اگر یہ پورا افسانچہ درج کردیا جاتا تو ''ققنس'' کا بار بار اپنی راکھ سے جنم لینے کا بھید زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتا۔ یہاں جوگندر پال کا پورا افسانچہ درج کردیتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے، اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ ہاں، اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو۔۔۔اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔

ہاں بابو، میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کرلوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔

نہیں، اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے، اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

مغربی دنیا میں مقیم اردو رائٹرز کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی ہیں۔ ایک جھلک یہاں پیش کردیتا ہوں۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط وضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جاسکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' (ققنس)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس مجموعہ کی گیارہ کہانیوں کا یہ مختصر سا تعارف تھا۔ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔آپ ایک افسانہ پڑھنا شروع کریں تو اسے ختم کیے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہے۔ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول، پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص۔پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ و جاپان کا کوئی بیان، رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیہ ہی میں نہیں اس ماحول میں بھی پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔یہ مہارت طویل ریاضت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

بیشتر کہانیوں میں انسانی المیوں کے مختلف روپ سامنے آتے جاتے چلے جاتے ہیں۔مختلف کرداروں کی انفرادی نوعیت کے زندگی کے گہرے صدمات سے لے کر، تقسیم برصغیر کے وقت ہونے والا قتل و غارت، عراق میں ہونے والی ہولناک جنگ، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے بعض خوفناک واقعات۔یہ سب المیے جو اِن افسانوں میں بیان کیے گئے ہیں موثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔پھر ان سب کے مقابلہ میں انسانی اقدار کو اجاگر کرتے ہوئے صوفیانہ روایات سے عمدہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس دھرتی کے انسانوں کے لیے امید کی روشنی دکھائی گئی ہے۔سو براہِ راست کسی نوعیت کی پیغام رسانی نہ کرتے ہوئے بھی رضیہ اسماعیل کے افسانے آج کے گلوبل

انسان کے مسائل کو ماضی کے مختلف علاقوں کے مسائل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ پھر وہ انہیں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں انسانی مستقبل کے انسان کے لیے پیار اور محبت کی وہ روشنی دکھاتے ہیں جو دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی اور قبولیت حاصل کرے گا اور عوامی سطح پر بھی اسے مقبولیت ملے ہوگی۔ انشاءاللہ!

حیدر قریشی (جرمنی)

۳۱ مارچ ۲۰۱۶ء

haider_qureshi2000@yahoo.com

رضیہ اسماعیل کی نئی تخلیق ''آدھی چادر''

رضیہ اسماعیل اتنی متنوّع صفات کی حامل شخصیت ہیں کہ رشک آتا ہے۔ شاعری کا میدان ہو۔اس میں جھنڈے گاڑے بیٹھی ہیں۔پانچ شعری مجموعے اپنا آپ منوا کر مزید ایک نئے اضافے سے خوشبو،گلاب، کانٹے کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آگیا ہے۔مزید دو مجموعے ''خوشبو اُرتی پھرے'' اور ''احساس کی خوشبو'' زیرِ طبع ہیں۔

میری اب تک کی اس خوبصورت شاعرہ سے شناسائی ادبی رسائل میں چھپنے والی اس کی غزلوں،نظموں اور یا پھر اس کی ''پوپ کہانی'' کے حوالے سے تھی۔ادب کی اس صنف کے آغاز اور اس کے بانی پر اس کے تحقیقی مضمون نے جس انداز میں بحث و مباحثے کے دروازے کھولے اور جس سے رسائل میں ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہوا۔ سچی بات ہے مجھے یہ سلسلہ اچھا لگا تھا۔یوں میں اس کے شعروں کی فکری گہرائی اور اس کے شعر گوئی میں تنوع کی مداح تو تھی ہی،مگر اس کی کلیات نے میرے اوپر بہت سی مزید پرتوں کو وا کیا۔اس کے اندر کی سچائی اور بے باکی جس طرح اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔اس کے کلام کی نغمگی اس میں ٹھاٹھیں مارتی غنایت ایک طرف اگر اس کا حسن بڑھاتی ہے تو وہیں اس کے اندر کے دُکھ اس کے لفظوں کے راستوں سے باہر آتے ہیں،اور آپ کو افسردہ کرتے ہیں۔

تاہم مجھے اس کے جس پہلو پر کچھ کہنا اور لکھنا ہے وہ اس کی نئی افسانوں کی

کتاب ''آدھی چادر'' سے ہے۔ مسودے کے مطالعہ سے احساس ہوا کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہی نہیں بلکہ اسے سلیقے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہے۔ ''آدھی چادر'' اِس مجموعے کی مرکزی کہانی جہاں وہ پاکستان کی کٹی پھٹی تقسیم پر نوحہ خواں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہم پاکستانیوں خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بھی اُن حقائق سے آگاہ نہیں جن پر اس کی کہانی نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ جابجا کرب اور دکھ کا اظہار بھی کرتی ہے۔

''ہرنام داس'' بھی تقسیم کے المیے میں گندھی کہانی ہے۔ ایک حساس بچی جو ہرنام داس کی بڑی سی حویلی کے دروازوں، کھڑکیوں، اُن کمروں میں دھرے برتنوں، فرنیچر، اُس گھر کی وسعت اور کشادگی سے باتیں کرتی ہے۔ جس کے اندر ایک اسرار پھیلا ہوا ہے جو احساسات کی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے کہانی کو بڑا منطقی انجام دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کا سفر ہے۔ اس ناسٹلجیا کے دُکھوں کا جس میں اس نے اپنا بچپن گزارا۔ جس کی تلخ یادیں اس کی یادداشتوں میں کسی خزانے کی طرح پڑی تھیں، جنہیں وہ اب ایک ایک کر کے کہانیوں کی بُنت میں بُن رہی ہے۔

''چیچا وطنی'' اُن کی ایسی ہی ایک اور اثر انگیز کہانی ہے۔ دو عورتوں کی محبت کا مرکز واحد مرد۔ دو عورتیں ایک خوبصورتی کی انتہاؤں پر اور دوسری قبولیت سے بھی نچلے درجے پر۔ کیا مقناطیسی چیز تھی جس نے مرد کو جکڑ لیا۔ کہانی میں بکھرا تجسس آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے مگر کہانی کہنے کے انداز کی دل کشی آپ کو روکتی ہے۔ موت سے متاثر ماحول کی عکاسی ایک سوگوار موج کی طرح آپ کو اپنے ساتھ بہاتے ہوئے اس کے رنگوں کا آشکارہ کرتی ہے۔

ذرا دیکھیئے۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔

نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔

نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔

نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔

گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔

ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔

آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔

چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سر زمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔

پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطمہ جٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

''دیوارِ گریہ'' بھی ایک خوبصورت دردانگیز کہانی ہے۔معاشرے کی جہالت، مردانہ استحصال،عورت کے تحفظ کی جبلّی خواہش اور اس کے حصول میں پے در پے دھوکوں سے بغل گیری۔

رضیہ کی کہانیوں کی زبان سادہ، اسلوب خوبصورت، موضوعات میرے آپ کے معاشرے کے دُکھ،اس کی کجیاں،اس کے رویّے سبھی زیرِ تحریر آتے ہیں۔وہ پراثر لکھنے پر قادر ہیں۔

''کیہ جاناں میں کون'' ایک اور بے حد اثر انگیز کہانی کہہ لیجیے یا ایک ملاقات، آپ کی مرضی۔ رضیہ نے کردار کو براہ راست اس کا حقیقی نام دینے سے پوری رازداری سے کام لیا اور صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں جیسی کیفیت پیدا کرنے کا انداز اپنایا ہے۔مگر جاننے والے بھی تو جانتے ہیں۔تاہم یہ ایک بھرپور تاثر چھوڑنے والی تحریر

ہے۔جو آپ کو ملول کرتی ہے۔اُن دکھوں سے آشنا کرتی ہے جو خدا کی اِس تخلیق کو نصیب ہوتے ہیں۔

رضیہ کے لئے دعا گو ہوں۔اُن کا یہ فنّی سفر جاری رہے۔ایک وسیع دُنیا اُن کے حصار میں رہتی ہے۔امید ہے کہ وہ مزید کہانیوں سے ہمیں ان کرداروں سے ملواتی رہیں گی جو اُنہیں لکھنے پر اُکساتے ہیں۔

نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ

سلمٰی اعوان (لاہور)

روشنی میں اندھیرا ، اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن ہے
میں دیے کو نہیں ڈھونڈتی ، اب تو مجھ کو دیا ڈھونڈتا ہے
(رضیہ اسماعیل)

روشنی کا تعاقب

''میں یہ سوچ کر اکثر اداس ہو جاتی ہوں کہ اگر مکانوں میں کھڑکیاں نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتا؟''

''دروازے تو خیر دروازے ہیں ، ان کی افادیت تو سب ہی جانتے ہیں مگر کھڑکیاں......کبھی ان کی افادیت پر بھی ہم نے سنجیدگی سے غور کیا ہے؟'' میں خود ہی سوال اور خود ہی جواب بن جاتی۔

اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے پٹ تھامے میں کافی دیر سے کھڑی تھی۔ پھر اچانک کچھ سوچ کر میں مسکرا اٹھی۔ مجھے لگا اس مسکراہٹ نے میرے اندر بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ ذہن کی کھڑکیاں، دل کی کھڑکیاں ، روح کی کھڑکیاں......

''کیا روح کی بھی کھڑکیاں ہوتی ہیں؟'' میرے اندر سے سوال گونجا۔

''ہاں ، ہوتی ہیں مگر یہ اتنی آسانی سے نہیں کھلتیں۔'' اندر سے ہی جواب آیا۔

''مگر کیوں؟'' سوال میرے لبوں تک آتے آتے رہ گیا۔مگر میرے اَن کہے سوال کے جواب میں ہی دل بول اٹھا۔

''یہ فنا قبل از فنا والا معاملہ ہے یعنی موت سے پہلے مر جانا، اپنی ذات کی مکمل نفی۔''

''مگر ذات کی نفی اتنی آسان نہیں ہوتی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے

جواب دیا۔

''ہاں ، اگر کوئی دوسرا آپ کی ذات کی نفی کرے تو یہ تکلیف دہ عمل ہو سکتا ہے لیکن جب آپ خود ہی اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں تو یہ مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔'' دل نے جواب دیا۔

''یہ فہم وادراک کی کون سی منزل ہوتی ہے؟'' میں نے پھر سوال کر دیا۔

''جب آدمی کو یہ پتا چل جائے کہ وقت کی تختی پر اس کی اہمیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔''

اندر سے مدلّل سا جواب سن کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھول دیئے۔

باہر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی زندگی اپنی تمام تر خباثتوں کے ہمراہ ایک زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔

پڑوس میں رہنے والا دوہا جو رحیمو جولاہا اپنی نئی نکور بیوی کو بلا وجہ ہی منہ بھر بھر کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ ذرا چوں چراں کرتی تو اُسے مارنے کو دوڑتا۔

رحیمو کی ننگی ننگی گالیاں سن کر گلی میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑے، دن رات کھوں کھوں کرتے ، اللہ وسائے موچی نے حقے کی نَے پرے کر کے بلغم زدہ گلے سے رحیمو کو سمجھانا شروع کر دیا۔

''اوئے ، رحیمو! اگر اس بے چاری پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اب دن رات گالیاں دینے سے اس کی جوانی کا منہ زور دریا تو اترنے سے رہا۔ پکی عمر میں سہرا باندھ کر گھوڑی پر بیٹھنا تو آسان ہے مگر گھوڑی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

رحیمو کے پاس اللہ وسائے موچی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور شاید اللہ

وسایا اس سے کسی جواب کی توقع بھی نہیں رکھتا تھا۔اس لئے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے دوبارہ زور شور سے حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔

کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے فرانز کافکا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''دنیا کتنی دل چسپ جگہ ہے؟ اس بات کا ندازہ کرنا ہو تو مٹھی بھر دنیا اپنی آنکھوں کے نزدیک لا کر غور سے دیکھو۔''

''میں بھی مٹھی بھر دنیا کو اپنی آنکھوں کے بہت نزدیک لا کر دیکھوں گی۔''میں نے ایک عزم سے کہا۔

اگرچہ مجھے اس بات کا ادراک تھا کہ بے حد نزدیک سے مشاہدہ کرنے والی دنیا کی نزاکتیں سوچ کی اور بہت سی کھڑکیاں کھول دیں گی۔

مگر میں نے اس مشاہدے سے حاصل ہونے والی لذت کے خیال سے سرشار ہو کر کچھ اور انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

میرے علم میں یہ بات تو تھی کہ رحیمو کی پہلی بیوی رحمتے چند مہینے قبل اسے ایک لمبی رفاقت کے بعد دائمی جدائی کا داغ دے کر جا چکی تھی اور اب رحیمو کو بیوی کی یاد میں دن رات آنسو بہاتے دیکھ کر سب ہی پریشان ہو رہے تھے۔رحیمو کو غم کی کھاٹ سے کسی طرح بھی اترتے نہ دیکھ کر اس کے بھائی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

''آخر بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے۔زنانی کی موت پر اتنا لمبا سوگ مناتے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، تو کوئی بڈھا تو نہیں ہو گیا رحیمے! ہڈ پیر سلامت ہیں۔اچھی کاٹھی ہے، مرد ذات کا کیا ہے، وہ تو ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے۔''

رحیمو کے بھائی سلطان نے اسے دوسری شادی کے لئے قائل کرنے کے لئے دلائل دینے شروع کر دیئے۔

سلطان کی بات سن کر رحیمو کچھ روز گومگو کا شکار رہا مگر پھر دوسری شادی کے خیال نے اس کے دل میں گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بغیر سوچے سمجھے ہی اس نے اپنے سے عمر میں کئی گنا چھوٹی لڑکی سے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ رحیمو کی اس ناسمجھی کا خمیازہ اب رحیمو کے ساتھ ساتھ سب محلے والے بھگت رہے تھے۔

یک لخت سوچ کی ایک ننھی سی کھڑکی میرے ذہن میں کھل گئی، ''بھلا رحیمو کو اس عمر میں نئی سیج سجانے کی کیا ضرورت تھی؟ رحمتے کے ساتھ اس کی ایک لمبی رفاقت کی سانجھ تھی۔ ازدواجی زندگی میں اگر چند سال بھی سکھ کے نصیب ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔ باقی ماندہ زندگی بھی انہی چند سالوں کے سہارے بُری بھلی گزر ہی جاتی ہے، مگر رحیمو نے تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے، اب موصلے تو پڑنے لازمی ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں رحمتے کی بجائے رحیمو کو مر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم اڑوس پڑوس والوں کی زندگیاں تو اجیرن نہ ہوتیں۔ رحمتے کا کیا تھا، صابر شاکر عورت تھی۔ اس بڑھاپے میں اُسے کہاں دوسرا خصم کرنے جانا تھا، یہ حق تو صرف مردوں کی رکھیل ہے۔'' ایک دن ماسی برکتے روز روز کی جوتم پیزار سے تنگ آکر غصے سے پھٹ پڑی۔

رحیمو کا تماشا ذرا ختم ہوتا تو ماسٹر دل محمد ڈگڈگی بجانی شروع کر دیتا۔ دن رات بے چاری ماسٹرنی کو گھُرکیاں دیتا رہتا۔ ماسٹرنی غریب گھر کی دبو قسم کی عورت تھی۔ ماسٹر کی زیادتیوں پر زبان کھولتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں تین کا پہاڑا پڑھ کر ماسٹر اس سے ہمیشہ کے لئے ہی نہ جان چھڑا لے۔

ماسٹر پرلے درجے کا کنجوس آدمی تھا۔ سکول جاتے ہوئے باورچی خانے کو تالا لگا کر جاتا، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر کی کمائی سے ماسٹرنی اپنے غریب رشتے داروں کو کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ اسی پر بس نہیں، ماسٹر گھر کے دروازے پر بھی بڑا سا تالا لگا دیتا تھا۔ ماسٹرنی سارا دن کھڑکی میں لٹکی گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر

ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ آنکھوں میں اترنے والی رم جھم کو اپنے میلے سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے کی ناکام کوشش اس کے دکھ کی مزید تشہیر کر دیتی۔

کھڑکی نے سرگوشی کی ''ماسٹرنی غریب گھر سے ضرور ہے مگر شریف عورت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات میں نہ جانے کیا کر گزرتی مگر ماسٹر کی ڈگڈگی ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' میں نے کھڑکی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر جیسے ہی نگاہ پلٹی، سارا منظر ریت کی طرح جھر جھر کر کے کہیں دور نکل گیا۔

میں نے ایک اور مٹھی بھر دنیا ذرا آنکھوں کے قریب لا کر دیکھنا چاہی تو گلی میں مجھے اوباش فیقا سر منہ سنوار کر ادھر ادھر تا کا جھانکی کرتا نظر آیا۔

اس تنگ سی گلی سے گزرنے والی نوجوان لڑکیوں پر گھٹیا قسم کے عاشقانہ فقرے اچھالنا اس کی عادت تھی۔ ایسے میں اگر کوئی جی دار قسم کی لڑکی پلٹ کر فیقے کو جواب دے دیتی تو فیقے کا حرامی پن سوا ہو جاتا۔ بڑی بے شرمی سے ایک آنکھ میچ کر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا، ''بسم اللہ، آؤ بادشاہو، تہاڈی اڈیک سی۔''

فیقے کی بات لڑکی کے تن بدن میں آگ سی لگا دیتی اور وہ جز بز سی ہو کر مزید کچھ کہے سنے بغیر جلدی جلدی گلی پار کرنے کی کوشش کرتی۔

''کچھ شرم کر فیقے! محلے کی دھی بہنوں کے ساتھ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کرتے۔'' ایک دن تیز طرار ماسی برکتے نے فیقے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔

''اوئے ماسی، تھوک کے حساب سے مجھے یہ بہنیں نہیں چاہیے۔ مجھے کیا ان کا اچار ڈالنا ہے؟ الٹا ان بہنوں کی فوج کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دے گی۔ ناں بھئی، میں کسی کو بہن وہن نہیں بناتا۔ میں تو انھیں ملکہ بنا کر دل

کے تحت پر بٹھاؤں گا۔'' وہ بڑے ڈھیٹ پن سے ماسی برکتے کی بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتا۔

''دُر فٹے منہ تیرا، شکل چنگی نہ ہو تو بات تو چنگی کر لینی چاہیے۔'' ماسی برکتے کی پھٹکار سن کر فیقا اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگتا۔

کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔

اس مرتبہ روح کی کھڑکی پر پڑنے والی دستک کی آواز میرے بہت اندر تک اتر رہی تھی۔ اندر اور باہر کے شور نے مل کر جیسے راگ بھاگیہ شری چھیڑ دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی اندر سے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ایسے میں اپنی ذات کے خول سے اندر باہر ہوتی ہوئی چودھری فضل دین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ریشم میری نظروں کے حصار میں آ گئی۔

میرے گھر سے ملحق چودھری کی بڑی سی حویلی کے پکے صحن میں گم سُم لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھری فضل دین کے دل پر آرے چل رہے تھے۔

چودھری دبی دبی آواز میں بڑی فکر مندی سے چودھرائن سے کہہ رہا تھا، ''بڑی وکھری قسم کی لڑکی ہے ریشم۔ نہ بچوں جیسی شرارتیں ہیں، نہ فرمائشیں، نہ سکھیوں سہیلیوں سے تو تکار، نہ گڈی گڈے کا بیاہ، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ صلح نہ صفائی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، گواچی گواچی سی، پتا نہیں ہر وقت کیا ڈھونڈتی رہتی ہے؟''

چودھری کی بات سن کر پاس بیٹھی ہوئی چودھرائن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، ''میرے لاکھ پوچھنے پر بھی منہ نہیں کھولتی۔ بس ٹر ٹر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس پر کوئی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں آ

گیا۔ پنڈ کے سائیں بابا کو نہ دکھا دیں۔ کوئی دم درود ہی کر دے گا۔ سنا ہے بڑی کرنی والا بابا ہے۔''

''ہوں'' چودھری کا بے حد مختصر سا جواب سن کر چودھرائن کچھ اور ہی فکر مند ہو گئی۔

چودھرائن کی ممتا کا سمندر زبردست ہلکورے لے لے کر امید و ناامیدی کے ساحلوں کو بھگو رہا تھا۔ چودھرائن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح وہ اپنی دکھوں کی سولی پر لٹکی ہوئی نازوں پلی اکلوتی اولاد کو مائیکل انجلو کے مجسمے میڈونا کی طرح ہاتھوں میں احتیاط سے اٹھا کر ایسی لوری سنائے جسے سن کر وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

''اٹھ میری سوہنی دھی، دن ڈھلنے کو ہے۔'' صحن میں ساری دوپہر تیز دھوپ میں سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھرائن نے بھرائی ہوئی آواز میں ایسے کہا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

صبح سے چودھرائن اُسے کتنی بار تیز دھوپ میں لیٹنے سے منع کر چکی تھی مگر ریشم ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

''اٹھ ریشو میری جان۔ سیانے کہتے ہیں جب دو وقت مل رہے ہوں تو لیٹنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ نحوست پھیلتی ہے۔ اٹھ شاباش!'' چودھرائن نے جیسے ہی بیٹی کو ہاتھ پکڑ کر چارپائی سے اٹھانا چاہا وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''اماں آپ سب مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ رب نے اگر میرے من کو سوچوں میں ڈال دیا ہے تو میں کیا کروں؟'' ریشم نے قدرے خفگی سے کہا۔

''ناں، دھی رانی! سوچتے تو ہم سب ہی ہیں مگر ہم نے تیری طرح جوگ نہیں لیا۔'' چودھرائن نے بیٹی کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اماں میری اور تیری سوچوں میں یہی تو فرق ہے۔ میرا دماغ سو سو سوال کرتا ہے اور تیرا دماغ سو سو جواب مانگتا ہے۔'' بیٹی کے تیز طرار جملے پر چودھرائن لاجواب سی ہو گئی۔

ریشم کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح کی کھڑکی پر کسی نے بڑا سا تالا لگا دیا تھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سے کھل نہیں پا رہا تھا۔

ہر سو اندھیرا، گھور اندھیرا تھا۔ ایسے میں اسے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ جنگلوں بیابانوں میں نکل جائے جہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کی آوازیں اسے سنائی نہ دیں۔ جہاں نہ چودھری فضل دین کی فکرمندیاں اس کا پیچھا کریں اور نہ ہی چودھرائن کے سوال اسے سوئی کے ناکّے میں سے گزرنے پر مجبور کریں۔ مگر کیسی مجبوری تھی وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی؟

پھر ایک دن مٹھی بھر زندگی ریشم کی آنکھوں کے بھی بہت قریب آ گئی۔

گاؤں کے باہر ایک کھلا میدان تھا جہاں گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے اکثر گائیں بھینسیں دن میں لیٹی اور بیٹھی ہوئی جگالی کرتی رہتی تھیں۔ بچے آنکھ مچولی کھیلتے، درختوں کی شاخوں سے جھولے جھولتے اور بہت اونچائی پر بنے پرندوں کے گھونسلوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتے۔ مگر جیسے ہی سورج ڈھلتا اور چراغ روشن ہوتے تو میدان بالکل سنسان ہو جاتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں وہ اس میدان میں کھڑی تھی......

میدان کے اُس پار سر سبز کھیتوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی کئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نہر کی طرف نکل جاتی تھیں۔ یہ نہر

جیسے جیسے گاؤں کے قریب آتی ،اس کا پاٹ چوڑا ہوتا جاتا تھا۔

دن کے وقت ندی پر کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ گاؤں والے مویشیوں کو نہلاتے ، پانی پلاتے ،عورتیں کپڑے دھوتیں، بچوں کو نہلاتیں اور خود بھی ادھ ننگی سی نہانے کے لئے پانی میں اتر جاتیں۔

ذرا فاصلے پر بنے ہوئے ندی کے پُل پر سے نوجوان لڑکے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور نہر کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں اگر کبھی تربوز تیرتے ہوئے آجاتے تو وہ انھیں پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑتے۔سخت گرمی کے موسم میں گویا یہاں ایک دنیا آباد رہتی تھی مگر اس وقت یہاں مکمل خاموشی تھی۔

شام کے گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں کھلے میدان کو پار کر کے آہستہ آہستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی ہوئی پگڈنڈی سے گزر کر وہ نہر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کنارے پر اسے ایک چمکیلی روشنی نظر آرہی تھی۔لیکن جیسے جیسے وہ نہر کے قریب ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ روشنی اُس سے دور ہٹتی جارہی تھی۔ مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ روشنی کی طرف بڑھتی رہی۔

نہر کے کنارے پر جا کر وہ بے حد مایوس ہوگئی ، کیوں کہ وہی روشنی اب نہر کے دوسرے کنارے پر چمک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ نہر میں چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے تک چلی جائے مگر نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔اس بے بسی کی کیفیت میں وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ نہر کے کنارے کھڑی ہو کر اُس پار چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھتی رہی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسی سلفے کی لاٹ تھی جو اس ویرانے میں چمک رہی تھی۔چاروں طرف آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی

تھی؟ کیسی تھی یہ روشنی جو باہیں کھولیں اسے اپنی طرف بلا رہی تھی؟

روشنی کے مجنونانہ تعاقب میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کے علاوہ کوئی ذی روح نہ تھا۔ گھر واپس جانے کے خیال سے وہ جیسے ہی پلٹی، اپنے پیچھے کھڑے ایک سائے کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

اندھیرے میں اُسے ٹھیک سے کوئی چہرہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سایہ اس سے مخاطب ہوا، گاؤں کے سائیں بابا کی آواز پہچان کر اس کی جان میں جان آ گئی۔

''روشنی کا پیچھا کر رہی تھی پتر؟'' بابا نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہاں بابا'' وہ جلدی سے بولی۔

''روشنی کا پیچھا کرو گی تو یہ تم سے اور دور ہو جائے گی۔'' بابا نے کہا۔

''وہ کیوں بابا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ ہم لوگ اپنے اندر کی روشنی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور روشنی کو ہماری یہ بے گانگی بالکل پسند نہیں ہے۔ اس لئے جب باہر نظر آنے والی روشنی کا تعاقب کرو تو وہ ہم سے اجنبیوں کی طرح دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔'' بابا نے بڑے صوفیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''بابا! کیا روشنی ہمارے اندر موجود ہے؟'' اس نے تجسس سے سوال کیا۔

''ہاں پتر، یہ روشنی ازل سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ دل تو سوہنے رب کا گھر ہے، اس کے نور سے روشن ہے مگر بدقسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خَلَقَ اللہُ الْخَلق فی ظُلُمٰتٍ ثُمَّ القرا عَلَیْہِ نُوْراً......''

یعنی کہ اللہ رب العزت نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا کیا مگر اس پر اپنے

نور کا پرتو ڈال کر اسے روشن کر دیا۔

وہ بہت غور سے بابا کی باتیں سن رہی تھی۔

''ہم دنیا دار کمینے اپنی نا عاقبت اندیشی سے نور کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر بجھے ہوئے دیوے لے کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔اپنی بدنصیبیوں اور اپنی بدبختیوں کے شکوے شکایتیں کرتے ہیں۔'' بابا نے قدرے جلال سے اونچی آواز میں کہا۔

''بابا نور کے چراغ کیسے بجھ جاتے ہیں؟ پتر بندہ ستر ہزار پرتوں سے بنا ہے اپنے رب کے حکم سے جب وہ عالمِ ارواح سے عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں آتا ہے تو اُس کے اوپر ایک پرت غالب آ جاتا ہے جس میں جلد بازی، سرکشی، بغاوت، حکم عدولی، ناشکری، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہی وہ دنیا کی زندگی ہے جسے قرآن نے اسفل السافلین کہا ہے۔''

سائیں بابا اپنی روانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''کیا یہ روشنی میرے اندر بھی موجود ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں پتر! یہ روشنی تو سب کے اندر موجود ہوتی ہے۔ تمھارے اندر بھی ہے۔'' بابا نے نرمی سے جواب دیا۔

''تو کیا یہ رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کے اندر بھی ہے؟'' اس نے اپنی بے یقینی کو یقین کا چولا پہنانے کے لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ہاں، پتر! یہ تو سوہنے رب کا نور ہے جو ہر دل کے اندر موجود ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر دل کی طاق پر نور کا ایک چراغ رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس چراغ کو اپنے عمل سے روشن رکھیں یا اپنی بداعمالیوں سے اسے بجھا دیں۔'' بابا کی باتیں سن کر

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''پتر ! زیادہ مت سوچو، بس اپنے اندر جھانکو، بجھا ہوا چراغ نگاہوں کی تپش سے خود بخود جل اٹھے گا۔ ہر طرف چانن ہی چانن ہو جائے گا۔روشنی کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے اندر کی روشنی کو تلاش کرو۔ اسے پہچانو، اس سے دوستی کرو، اس سے ہاتھ ملاؤ، یہ تمھاری اپنی روشنی ہے۔اس سچے رب کا نور ہے جو ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہر وقت ہمارے قریب رہتا ہے'' اتنا کہہ کر سائیں بابا۔

''الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے مرشد من وچ لائی ہو
اندر بوٹی مُشک مچایا جاں پھُلن تے آئی ہو''

کہتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اللہ ہُو کی دھمک جیسے ہی ریشم کے دل پر پڑی تو اُسے یوں لگا جیسے اس کی روح کی بند کھڑکی کھل گئی ہو، سب اندھیرے چھٹ گئے ہوں۔

ہر سو نور کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔اسے اپنے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔کیوں کہ اب اندر سے کوئی سوال کر رہا تھا:

تمھارے ہاتھ میں سورج بھی ہے، چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں؟

لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، وہاں نہ سائیں بابا تھا، نہ نہر کا کنارہ، نہ کھیت، نہ کھلیان تھے۔

بس طمانیت کا ایک بھرپور احساس تھا جو اس کے چاروں طرف اللہ ہو کی دھمال ڈال رہا تھا۔

میں نے بھی اسے مطمئن پا کر مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔

○

مکاں پکے ہوں یا کچے، ہمیں اس سے غرض کیا ہے؟
ہمیں تو کوچ کرنا ہے یہاں بسرام سے پہلے
(رضیہ اسماعیل)

ہرنام داس

ہرنام داس کے نامانوس سے نام سے میری پہچان شعور کی آنکھ کھولتے ہی ہو گئی تھی۔

اس نام کی چھاپ نہ صرف حویلی کے در و دیوار بلکہ اس کی ہر ایک چیز پر ہی بہت گہری تھی۔ گاگر، پرات، گلاس، پلیٹیں، چھنے، کف گیر، یہاں تک کہ بستروں کی چادروں، کمبل، کھیس، تلائیوں، رضائیوں اور تکیے کے غلافوں پر بھی جگمگاتا ہوا ہرنام داس کا نام میرے ذہن کی تختی پر کئی طرح کے نقش و نگار بناتا رہتا تھا۔

وسیع و عریض حویلی کے کمروں میں مجھے اکثر ان دیکھے ہرنام داس کا اداس اداس سا ہیولا منڈلاتا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دن اچانک ہرنام داس میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا مگر میں یہ سوچ کر ہی گھبرا اٹھتی تھی۔

آخر ہرنام داس کون تھا؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ کیسا شخص تھا وہ جو اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلا گیا؟ میرے ذہن میں بہت سے سوال جوابوں کے لئے بے چین تھے۔

میں جیسے جیسے شعور کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی سچ پوچھو تو مجھے ہرنام داس سے ایک طرح کی ہمدردی سی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن کھانا کھاتے ہوئے پیتل کے بڑے سے گلاس کے پیندے پر ہرنام داس کا نام کندہ دیکھ کر میں نے بالآخر ماں سے پوچھ ہی لیا،''ماں ! یہ ہرنام داس کون ہے؟''

میرے منہ سے ہرنام داس کا نام سن کر توے پر روٹی ڈالتی ہوئی ماں یوں بِدکی جیسے اس نے کوئی بے حد ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔ ماں کا ہاتھ سخت گرم توے کے ساتھ جلتے جلتے رہ گیا۔

''تجھے اس سے کیا؟'' ماں نے درشتگی سے جواب دیا۔''خاموشی سے ناشتہ ختم کر کے سکول جا! جب دیکھو الٹے سیدھے سوال کرتی رہتی ہے۔''

ماں کے حوصلہ شکن جواب سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش وقتی طور پر تو سرد سی ہوگئی مگر یہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

سکول میں سبق یاد کرتے ہوئے بھی میرا دھیان ہرنام داس کی طرف ہی لگا رہا۔ ہِل ہِل کر''ا''، ''ب''، ''پ'' کی تختی پڑھتے ہوئے جیسے ہی میں''ہ'' پر آئی تو یک دم میرے منہ سے نکل گیا،''میڈم''ہ'' سے''ہل'' کے علاوہ''ہرنام داس'' بھی بنتا ہے۔'' میری زبان سے یہ نامانوس سا نام سن کر میڈم نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔

گھر میں ہرنام داس کے نام سے جس قدر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے حویلی کے چپے چپے سے اس نام کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار تو مجھے لگتا کہ شاید ہرنام داس میرے دادا تھے جنھوں نے ابا کو اپنی پسند کی شادی کرنے پر جائیداد سے عاق کر دیا تھا اور غصے میں ابا کو حویلی سے نکالنے کی بجائے خود ہی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔

ایک دن ابا کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے ہرنام داس کا ذکر چھیڑ دیا، ''ابا! ہرنام داس کیا میرے دادا تھے؟'' میرے اس اچانک سوال پر ابا کی بڑی بڑی آنکھیں غصے اور حیرت سے مزید پھیل گئیں۔

''چُپ نا ہنجار! ہرنام داس تمھارے دادا کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم مسلمان ہیں اور یہ تو ہندوانہ نام ہے۔''

میں اپنے بے تکے سوال پر شرمندہ سی ہو کر رہ گئی۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' ابا کی بے طرح ڈانٹ سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔

ہمارے گھر میں لگتا تھا کہ دادا کی طرح ہرنام داس کا نام لینا بھی ممنوع تھا کیوں کہ دونوں کا نام سنتے ہی اماں اور ابا کی پیشانیاں شکن آلود ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کے شہد میں گھلے ہوئے لہجے ایک دم بِس ٹپکانے لگتے مگر اس قدر نامساعد حالات کے باوجود بھی میں ہرنام داس کے بارے میں سوچنے سے کنارہ کش نہ ہو سکی۔

حویلی کی شان و شوکت دیکھ کر لگتا تھا کہ ہرنام داس نے گاؤں کی واحد دو منزلہ پختہ حویلی کو بڑے دُلار سے بنایا ہو گا۔

حویلی کی نچلی منزل پر گلی کی طرف ایک کافی کشادہ بیٹھک تھی جو اب مردانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی دو بڑی بڑی کھڑکیاں اور نقش و نگار سے مزین ایک مضبوط چوبی دروازہ تو گلی میں کُھلتا تھا جب کہ دوسرا دروازہ گھر کی جانب بیٹھک سے ملحقہ بڑی سی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ بیٹھک میں سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی چیز اس کی کشادگی کے علاوہ ایک ساگوان کا نہایت ہی خوب صورت قدِ آدم آئینہ تھا جو دیوار میں بڑی مضبوطی سے نصب کروایا گیا تھا اور اس کی پیشانی پر بھی ہرنام داس کا نام کندہ تھا۔

ڈیوڑھی کا بڑا سا آہنی دروازہ اکثر بند رہتا تھااور خاص خاص موقعوں پر ہی کھلتا تھا جب کہ اس میں بنا ہوا ایک اور چھوٹا دروازہ گھر میں آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس دروازے کے اوپر بھی ہرنام داس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا جسے ابا نے ''ھٰذا مِن فضلِ ربی'' میں تبدیل کروادیا تھا۔

مجھے اکثر اس دروازے سے رونے کی آوازیں آتی تھیں جیسے سسکیاں لیتا ہوا دروازہ کہہ رہا ہو۔

گلی کے موڑ پہ سونا سا ایک دروازہ
ترستی آنکھوں سے رستہ کسی کا دیکھے گا

ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ دو بڑے سے برآمدوں میں کھلتا تھا۔ برآمدوں کے دونوں طرف دو رسوئیاں بنی ہوئی تھیں۔ڈیوڑھی کے پاس کُھلی رسوئی گرمیوں میں استعمال ہوتی تھی جب کہ برآمدوں کے دوسرے سرے پر بنی ہوئی پختہ رسوئی سردیوں میں زیرِ استعمال رہا کرتی تھی۔

اِس رسوئی میں بنی ہوئی ایک بڑی سی چمنی سے سردیوں میں سانپ کی طرح لہرالہرا کر نکلتا ہوا دھواں مجھے بہت بھلا لگا کرتا تھا۔ہم سب بہن بھائی اس رسوئی میں سردی میں آگ کے نزدیک بیٹھنے کے لئے اپنی اپنی چھوٹی سی رنگین پیڑھیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چولھے کے بہت قریب لاتے تو ماں ڈانٹ دیتیں، ''ارے کم بختو! جل مرنے کا ارادہ ہے کیا؟، پرے ہٹو!'' ماں کی ناراضگی کے خیال سے ہم اپنی اپنی پیڑھیاں قدرے پرے گھسیٹ کر بیٹھ جاتے۔

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے ہی میرا ننھا سا ذہن پھر ہرنام داس کا پیچھا کرنے لگتا۔

''کیا ہرنام داس کی ماں بھی اسی طرح اسے چولھے کے نزدیک بیٹھنے پر ڈانٹتی

ہو گی؟ کیا اسے بھی سردیوں میں رسوئی کی چمنی سے سانپ کی طرح لہرا لہرا کر نکلتا ہوا دھواں اچھا لگتا ہو گا؟'' ایسے میں مجھے لگتا کہ ہرنام داس ایک چھوٹا سا بچہ بن کر رسوئی کی خالی پیڑھی پر بیٹھا ہم سب کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

حویلی کے پکے صحن کے دونوں اطراف برآمدے تھے جب کہ تیسری جانب ایک بڑا سا کمرہ تھا جو سردیوں میں مال مویشیوں کے باندھنے اور چارہ رکھنے کے کام آتا تھا۔ صحن کی چوتھی جانب بہت بڑا قطعۂ زمین تھا جس میں رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کے علاوہ پیپل، شیشم اور نیم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ ان کی چھاؤں میں گرمیوں میں مویشی بیٹھے جگالی کرتے رہتے تھے۔

اسی صحن کے ایک کونے میں تازی خانہ تھا جہاں ابا کے شکاری کتے ہمہ وقت منہ کھولے ہانپتے رہتے تھے۔ ان ہانپتے ہوئے کتوں کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے یہ سب ابھی ابھی ہرنام داس کو یہاں سے بھگا کر کہیں دُور چھوڑ کر لوٹے ہوں۔ پتلی پتلی تھوتھنیوں والے یہ پھرتیلے سے شکاری کتے مجھے بہت برے لگتے تھے، اس لئے ان سے میری کبھی بھی دوستی نہ ہو سکی۔

حویلی میں دو بڑے دالان تھے جن کی کھڑکیاں پکی رسوئی کے ساتھ والے برآمدے میں کھلتی تھیں۔ ان دونوں دالانوں کے پیچھے کئی چھوٹے بڑے کمرے تھے جن میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا رہتا تھا۔ ابا نے سختی سے ہم تینوں بہنوں اور چھوٹے بھائی کو ان کمروں میں جانے سے منع کر رکھا تھا۔ ''شاید وہاں ہرنام داس کا بھوت رہتا ہو گا۔'' میرا ننھا سا ذہن پھر الجھنے لگتا۔

سب سے بڑے دالان میں دن کے وقت بہت رونق رہتی تھی، کیوں کہ یہ کمرہ افرادِ خانہ کے ہمہ وقت اٹھنے بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس دالان کے ایک کونے میں جہازی سائز کا چوبی پلنگ تھا جس کے بڑے بڑے رنگین پایوں پر بہت

خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ہم سب بہن بھائی ان پایوں کے ساتھ جھولتے اور پلنگ کے نیچے چھپ کر آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔

پلنگ کا سرھانہ ایک قدِ آدم آئینے کی مانند تھا جس کے درمیان میں ایک بڑا شیشہ نصب تھا جس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے خوب صورت رنگین شیشے لگے ہوئے تھے جن میں ہم سب بہن بھائی اکثر اپنا اپنا چہرہ دیکھا کرتے تھے۔بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے ہرنام داس یاد آ جاتا، کیا وقت نے ہرنام داس کا چہرہ بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہوگا؟

اس آئینے کے اوپر بھی ہرنام داس کا لکھا ہوا نام دیکھ کر میں سوچ میں پڑ جاتی کہ ''ہرنام داس کو آئینے اتنے اچھے کیوں لگتے تھے؟ مگر ان آئینوں نے تو اس سے بے وفائی کر ڈالی۔'' ذہن سے آواز ابھرتی۔

''آئینے بے وفا نہیں ہوتے، بس اپنے اوپر پڑنے والا عکس منعکس کر کے دکھا دیتے ہیں۔اب وہ چاہے ہرنام داس کی شبیہ ہو یا کسی اور کی۔''

میرے لئے حویلی کا سب سے زیادہ دل چسپ کمرہ دوسرا دالان تھا جو اس وقت سٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔اس پر ہر وقت تالا لگا رہتا تھا۔ماں کے علاوہ گھر کی مہری اور کارخانے کا منشی وہاں اکثر جاتے رہتے تھے۔اس کمرے میں بے شمار چیزیں تھیں جن میں کاشت کاری کے آلات و اوزار، برتن، فرنیچر، بستروں والی بڑی پیٹی، اجناس کے کنستر، اچار کے مرتبان، سرکے، شہد اور شربت کی بے شمار بوتلیں قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں۔جب بھی اس کمرے کا دروازہ کھلتا میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دروازے کے ساتھ چپک جاتی تھی کیوں کہ ہمیں اس کمرے کے اندر پاؤں رکھنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔

مجھے اس کمرے کی دیگر چیزوں سے تو کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی مگر وہاں

پیتل، تانبے، کانسی اور چاندی کے بے شمار چھوٹے بڑے برتن دیواروں پر بنی ہوئی بڑی بڑی پر چھتیوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے جو مجھے بہت پُر اسرار لگا کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان تمام برتنوں کی پشت پر بھی ہرنام داس کا نام ہی کھدا ہوا ہو گا۔ یہی برتن مجھے بار بار اس کمرے کی طرف کھینچتے رہتے تھے۔ جب تک کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا، میں باہر کھڑی بڑی محویت سے ان برتنوں کو دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن مجھے یوں لگا جیسے سب برتن آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہوں۔ ''پتا نہیں ہمیں کب اس قید سے رہائی ملے گی؟'' ایک بڑی سی پرات نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''خود تو چلے گئے اور ہمیں سولی پر لٹکا گئے۔''

''برتن تو استعمال کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور یہاں دن رات پر چھتیوں پر لٹکا کر ہمارا تماشا بنا رکھا ہے۔'' ایک بڑی سی گاگر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

چاندی کی نہایت نفیس طشتری ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بولی، ''یہ تو سب نصیبوں کی باتیں ہیں۔ وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا؟''

''ہر چیز وقت اور موت کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔'' ایک کونے میں پڑی ہوئی بڑی سی جست کی پیٹی نے کسی بوڑھے فلسفی کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس پیٹی کے دُکھ شاید سب سے زیادہ تھے۔ ایک تو وہ خود قید میں تھی، دوسرا اس کے اندر رکھی ہوئی بے شمار چیزیں بھی دن کی روشنی دیکھنے کے لئے ترستی رہتی تھیں۔ بعض اوقات یہ سب چیزیں مل کر اس قدر شور کرتیں کہ پیٹی انھیں چُپ کراتے کراتے ہلکان ہو جاتی تھی۔

مجھے لگتا کہ پیٹی کا دکھ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیوں کہ اگر اس کمرے کے مکین جانتے ہوتے تو اس سے ہمدردی ضرور کرتے مگر انھیں تو بس اپنی اپنی

پڑی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ ابا نے ہرنام داس کو مار کر اس کمرے میں پیٹی کے نیچے دبا دیا تھا اور حویلی کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔ بڑی سی پیٹی کے نیچے ہرنام داس کی بے نام سی قبر پر نہ کوئی پھول چڑھانے والا تھا اور نہ ہی کوئی دیا جلانے والا۔

ایک دن میں نے ماں کو پڑوس کی ماسی خدیجہ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ''ہندو اپنے مُردوں کو شمشان گھاٹ میں جلاتے ہیں ورنہ ان کی آتما بھٹکتی رہتی ہے۔''

اسی دن سے میں یہ منصوبے بنانے لگی کہ ہرنام داس کا مُردہ کیسے جلایا جائے۔ کیا ساری حویلی کو آگ لگا دی جائے یا صرف اس کمرے کو؟

ماں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہرنام داس کی اداس سی آتما اس حویلی میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اس کی شانتی کے لئے اسے آگ میں جلانا ضروری تھا۔

ہرنام داس کا خیال یوں ہی میرے ساتھ دن رات آنکھ مچولی کھیلتا رہتا مگر عملی طور پر میرے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔

ایک دن گاؤں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ سب بھاگم بھاگ چوپال کی طرف جا رہے تھے۔

''سنا ہے ہندوستانی ملٹری آئی ہے، گھر گھر تلاشی لیں گے۔'' گلی میں تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے بختو موچی نے کسی دوسرے آدمی سے کہا۔

میرا دل چاہا کہ میں بھی بھاگ کر بختو موچی کے پیچھے پیچھے چوپال کی طرف جاؤں اور ملٹری والوں کو بتاؤں کہ میرے ابا نے ہرنام داس کو مار کر سٹور میں بڑی سی پیٹی کے نیچے دبایا ہوا ہے مگر مجھے اتنی دُور چوپال میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ملٹری ہمارے گاؤں میں ہرنام داس

کو تلاش کرنے کے لئے ہی آئی ہے اور کسی وقت بھی وہ ہماری حویلی میں آ جائے گی۔
میں دم سادھے ڈیوڑھی میں ماں کے پاس بیٹھی ہوئی گلی میں سے فوجی بوٹوں کے ساتھ دندناتے ہوئے پاکستانی اور ہندوستانی ملٹری کے جوانوں کو گزرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا؟ یہ سب تو ہماری حویلی کے سامنے سے گزر کر آگے چلے گئے ہیں؟''
میں نے خود سے سوال کیا۔

میرا الجھا الجھا سا ذہن کہہ رہا تھا کہ ''ہرنام داس تو یہاں دفن ہے مگر یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟'' مگر ماں سے کچھ بولنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

''وہ اگلی گلی کے نکڑ والے گھر میں بڑا خزانہ چھپا کر گئے تھے اور اب ہندوستانی ملٹری کو ساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ اس گھر کو کھود کر یہاں سے خزانہ نکالیں۔'' کوئی گلی میں کہتا ہوا جا رہا تھا۔

''اچھا، اچھا، وہی گھر جس میں مہاجر آکر آباد ہوئے ہیں!''

''ہاں، بالکل وہی بڑا سا گھر۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ چلو یار وہاں چل کر ہم بھی تماشا دیکھتے ہیں۔ دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں ملٹری کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر جوق در جوق خزانے کی تلاش کا تماشا دیکھنے اُمڈ پڑے۔

گھر کے لٹے پٹے مکین الگ افسردہ تھے کہ اس خزانے کا علم انھیں کیوں کر نہ ہو سکا وگرنہ وہ اسے کھود کر نکال لیتے۔

دو روز کی سخت کھدائی کے بعد بھی زمین میں دبائی گئی پیتل کی چھ گاگروں میں بند سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور نقدی کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ تیسرے روز کھدائی اتنی گہری ہوگئی کہ زمین سے پانی رِسنے لگا تو گاؤں کے نمبردار نے، جو اس سارے معاملے کی نگرانی کر رہا تھا، ہاتھ اٹھا دیے کہ ''بس، اب اس سے زیادہ کھدائی کی گنجائش

نہیں ہے وگرنہ گھر کی دیواریں مسمار ہونے کا خطرہ ہے۔''

مجھے پورا یقین تھا کہ خزانے کی کھدائی سے فارغ ہو کر ملٹری ہمارے ہاں ہی آئے گی اور ہرنام داس کی لاش کو سٹور سے باہر نکالے گی مگر اسی روز سہ پہر کو ملٹری کے تمام جوان گاؤں سے واپس چلے گئے تو میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔

سیانے کہتے ہیں'' کچھ عرصے کے بعد خزانہ اپنی جگہ سے کھسکنا شروع ہو جاتا ہے۔''نمبردارنی کسی سے کہہ رہی تھی۔

''کہیں یہ خزانہ کھسکتے کھسکتے نمبردار کے گھر تو نہیں چلا گیا؟''میرے ذہن میں سوال کا کیڑا پھر کلبلانے لگا۔

''لگتا ہے خزانہ چل پڑا ہے۔''ایک اور آواز آئی۔

''بھلا خزانہ کوئی ہرنام داس ہے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑا ہے۔''میں نے ترنت دل ہی دل میں جواب دیا۔

گاؤں میں ملٹری والے واقعہ کے بعد کافی دنوں تک ابا افسردہ اور بے حد خاموش سے رہے۔ابا کی اس قدر طویل خاموشی مجھے بہت کھل رہی تھی۔

پھر ایک رات تاریکی میں سے جیسے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے کتابِ زیست کے کتنے ہی ورق ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

پردے آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔

حجاب اٹھتے گئے۔

گرہیں کھلتی گئیں۔

میں دم سادھے ساتھ والے بستر پر سوتی جاگتی ابا اور اماں کی سرگوشیاں اور کبھی قدرے اونچی آواز میں ہوتی ہوئی باتیں...... کبھی سرد آہیں...... کبھی سسکیاں...... کبھی آنسو تو کبھی ہچکیاں، سننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے آدھی ادھوری باتوں سے ہی میری سماعتوں میں شگاف سے پڑتے جا رہے تھے۔

بن کے رہے گا پاکستان...... بٹ کے رہے گا ہندوستان...... لے کے رہیں گے پاکستان...... مسلم لیگ...... کانگریس...... جناح...... نہرو...... گاندھی...... ریڈکلف ایوارڈ...... تقسیم...... بٹوارا...... فسادات...... قتل و غارت...... اغوا...... جلاؤ گھیراؤ...... چیخ پکار...... منتیں سماجتیں...... لاشوں سے بھرے کنوئیں...... کٹی ہوئی چھاتیاں...... ادھڑے ہوئے پیٹ اور نیزوں پر لٹکتے ہوئے نوزائیدہ وجود...... سہانا خواب...... لہو رنگ تعبیر...... ابا اور اماں کی پسند کی شادی...... دادا ابا کا انھیں گھر سے نکال دینا...... امرتسر کی حویلی...... سکھوں کے جتھے...... بلوائیوں کا حویلی میں آگ لگانا...... لوٹ مار...... دادا...... دادی...... چچا ظفر کا شہید ہونا۔

چشمِ فلک تاریخ کے ہولناک ترین مناظر دیکھ رہی تھی۔

ابا کہہ رہے تھے، ''جب میں نے ریحانہ کو تاک کر برچھی ماری تو وہ سیدھی اس کے دل پر جا کر لگی۔ مجھے ریحانہ کی وہ نگاہیں نہیں بھولتیں جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ جن ہاتھوں سے مجھے اُسے ڈولی میں بٹھانا تھا، انہی ہاتھوں سے میں نے اسے خون میں نہلا دیا۔ مگر میں کیا کرتا؟ اُسے اُس روز نہ مارتا تو وہ زندگی بھر ہر روز ہزار بار مرتی۔''

وقت کے سینے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہوئے ابا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

''کیسے کیسے ہولناک منظر دیکھنے پڑے۔ کن مشکلوں سے صرف جانیں ہی بچا کر نکلے...... بھرے پُرے گھر چھوڑ دیئے۔ نہ جانے کس کے نصیب میں وہ سب تھا...... اور اِدھر ہمارے نصیب میں ہر نام داس......'' اماں نے گلوگیر لہجے میں بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اَن چاہی ہجرتیں انسان کے وجود کو بہت سے ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہیں اور باقی ساری زندگی ان ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویریں مکمل کرنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ فضا میں جیسے ایک سرگوشی سی ابھری۔

''دیکھا نہیں تھا، امرتسر اور لاہور کے درمیان کا علاقہ لاشوں سے کس طرح اٹا پڑا تھا جیسے کوئی بہت وسیع قبرستان ہو۔''

ابا نے اَدھ مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور دونوں کی سسکیاں رات کی تاریکی میں ایک دوسرے میں آہستہ آہستہ مدغم ہوتی چلی گئیں۔

سردی کی ایک زبردست لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر چکی تھی۔

مجھے لگا کہ میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح مر چکی ہوں اور میری لاش بھی لاہور اور امرتسر کے درمیان کہیں بے یار و مددگار، بے گور و کفن پڑی سوال کر رہی ہے۔

اگر ہجرت ابا، اماں اور ہرنام داس کے مقدر میں لوحِ ازل پر لکھی جا چکی تھی۔ تو پھر کیا اِس قدر کشت و خون ضروری تھا؟

''اس ادل بدل میں کس نے کیا پایا اور کیا کھویا؟''

جس مٹی سے ان کے خمیر اٹھے، اسے یوں بے سر و سامانی میں چھوڑتے ہوئے ان سب نے کیا سوچا ہوگا؟

وقت نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب بڑے بڑے طاقت ور اور حوصلہ مند لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ''is this all?''

یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔

○

داغِ ندامت دھونے دے اب
اپنا آپ بھگونے دے اب
(رضیہ اسماعیل)

سوری

سوری بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کے اندر جذبات اور احساسات کا ایک مکمل جہان آباد ہے۔

میں نے اس سے پہلے کبھی لفظ ''سوری'' پر اس قدر غور نہیں کیا تھا۔

مغربی معاشرت میں تقریباً آدھی سے زیادہ زندگی گذارتے گذارتے میں تھینک یو پلیز اور سوری کہنے کا اس قدر عادی ہو گیا ہوں کہ بعض اوقات تو یہ الفاظ محض مجھے تکیہ کلام لگنے لگتے ہیں جنہیں شاید میں بہت زیادہ سوچ بچار کئے بغیر ہی تہذیب و اخلاق کے اعلیٰ اصولوں کے پیش نظر بڑے میکانکی انداز میں ادا کرتا رہتا ہوں۔

میں نے زندگی میں لفظ ''سوری'' خود بھی بے شمار مرتبہ ادا کیا ہے اور دوسروں سے بھی سنا ہے مگر میری پچاس سالہ زندگی میں ایک اجنبی شخص نے جس طرح سے اس لفظ کی ادائیگی کی اس نے میری روح کے بہت اندر تک گویا گراری سی پھیر دی اور میں پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔

اس چھوٹے سے لفظ کو ادا کرتے وقت وہ سخت اذیت کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ اس اجنبی کے چہرے پر شدید کرب، ندامت، پشیمانی اور احساس جرم کی چھاپ حقیقتاً اس قدر گہری تھی کہ میں زیادہ دیر تک اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔

چار حرفی لفظ سوری کی بہت بڑی حقیقت آج مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔

رات تقریباً آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب میں اپنی بیوی سوسن اور بیٹی شعاع کے ساتھ آکسفورڈ کے اپالو تھیٹر سے مشہور انگریز کامیڈین بل بیلی (Bill Bailey) کا سٹینڈ اپ کامیڈی کا شو دیکھ کر باہر نکلا۔

ہم تھیٹر سے باہر نکل کر ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اتنی رات گئے ہوٹل تک پیدل ہی مارچ کیا جائے یا پھر ٹیکسی پکڑی جائے کہ اس اجنبی شخص سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے آہستہ سے کتاب زیست کا ایک ورق اُلٹ دیا ہو۔

آج سے تقریباً تیس برس قبل میری اور سوسن کی ملاقات اسی شہر میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرتے ہی ہم دونوں نے ایجاب و قبول کر لیا تھا۔ یوں تو ہمارا مستقل ٹھکانہ لندن میں تھا مگر ہم کم از کم پچھلے پچیس برسوں سے اپنی شادی کی سالگرہ منانے آکسفورڈ ہی آیا کرتے تھے۔

ہم دونوں کو ہی اس شہر بے مثال سے عشق تھا۔ اس شہر نے اوائل عمر میں ہماری شخصیتوں کی اٹھان دیکھی تھی۔ بنتے بگڑتے ہوئے ہمارے شب و روز دیکھے تھے۔ سب سے بڑھ کر اس شہر کی فضائیں ہماری محبت کی گواہ تھیں۔ ہم خود تو آکسفورڈ سے نکل گئے مگر آکسفورڈ ہمارے اندر سے کبھی بھی نہ نکل سکا۔

آکسفورڈ کے ساتھ اس قدر جذباتی وابستگی سے ہماری بیٹی شعاع خوب واقف تھی۔

اس مرتبہ اس نے ہمیں سرپرائز دینے کے لیے ہمارے فیورٹ کامیڈین کے شو کے ٹکٹ خرید رکھے تھے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یونیورسٹی لائف میں اکثر میں اور سوسن اپنے دوستوں جیک، ٹینا اور جل کے ساتھ اس تھیٹر میں آیا کرتے تھے۔

دراصل یہ شہر پہلی ہی نظر میں مجھے بھا گیا تھا۔ جس طرح کچی عمروں کے خواب زندگی بھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اسی طرح آکسفورڈ اور خاص طور پر ماڈلن (Magdalen) کالج کی محبت میرے دل میں ہمیشہ کے لیے گھر کر چکی تھی۔

جب میں پہلی مرتبہ پاپا کے ساتھ یہاں آیا تو میری عمر یہی کوئی تیرہ چودہ برس رہی ہوگی۔ پاپا اپنے دوست انکل اظہر سے ملنے یہاں آئے تھے جو اس کالج میں درس و تدریس سے وابستہ تھے۔

پاپا تو سارا وقت انکل اظہر سے گپ شپ کرتے رہے مگر میں سحر زدہ سا ماڈلن کالج کی پرشکوہ عمارت، اس کے فن تعمیر، اس کے مرغزاروں اور اس سے ملحقہ ڈیر پارک (Deer Park) اور ایڈیسن ریور سائیڈ واک (Addison River Side Walk) میں کھویا رہا۔ میری محویت دیکھ کر انکل اظہر بتا رہے تھے کہ ماڈلن کالج آکسفورڈ کے تمام کالجوں کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ کالج قدیم اور جدید طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔ اس کی تقریباً سو ایکڑ پر پھیلی ہوئی گراؤنڈز اسے ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس کالج کو اپنی انفرادیت کے حُسن پر ناز ہے۔"

"انکل آپ ہمیں سارے کالج کی سیر کروائیں نا۔" میں جیسے نیند کی کیفیت میں گویا ہوا۔

"Sure Sure" انکل اظہر نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

کالج کی شاندار لائبریری، ڈائننگ ہال، کامن روم اور بار کی سیر کرواتے ہوئے انکل اظہر کہہ رہے تھے:

"آکسفورڈ کالجوں کا شہر ہے۔ یہاں اس وقت تیس سے زیادہ کالج دور و نزدیک سے آئے ہوئے طالبان علم کی تشنگی کو سیراب کرتے ہیں۔ تعلیمی سال کے آغاز

میں تو اس شہر میں ایک میلے کا سماں ہوتا ہے۔ جہاں دنیا کے مختلف خطوں کے نمائندہ طلبا وہاں کی چہل پہل اور رونق کا حصہ ہوتے ہیں۔ مختلف کلچرز اور ثقافت کے امتزاج سے یہاں کی معاشرتی زندگی ایک نئے ہی سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔''

"Very cosmopolitan atmosphere." پاپا نے انکل اظہر کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں ہر کالج کا سیٹ اپ تقریباً ایک جیسا ہی ہے مگر ہر کالج کی اپنی شناخت اور مخصوص نام ہے۔ کالج کو یہاں عموماً ہال کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہر کالج کے اپنے لونگ کواٹرز ہوتے ہیں جہاں سٹوڈنٹس رہائش پذیر ہوتے ہیں۔

انکل اظہر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے انہیں کالج کے بارے میں مزید بتانے پر اصرار کیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے ''اس کالج کی مقبولیت کا اصل راز اس کی خوبصورتی کے علاوہ اس کی طرح طرح کی کلچرل سوسائٹیز ہیں۔ جن میں فلم، ڈرامہ، پوئٹری، میوزک، فٹ بال، ہاکی، رگبی، کرکٹ، تیراکی اور کشتی رانی شامل ہیں۔''

"How interesting!" میں نے پر شوق لہجے میں کہا تو انکل دوبارہ بولے کہ ''اگر کبھی موقعہ ملے تو اس کالج کے کوائر (Choir)، آرکسٹرا، بینڈز اور جاز گروپس کی پرفارمنس ضرور دیکھنی چاہیے، Absolutely amazing ہوتی ہے۔''

آکسفورڈ سے واپسی پر میں کسی گہری سوچ میں تھا اور میری آنکھیں کسی آنے والے زمانے کا خواب دیکھنے میں محو تھیں۔

مجھے اس قدر خاموش دیکھ کر پاپا نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا

"Why are you so quiet?"

''کیا آکسفورڈ پسند نہیں آیا؟''

''ایسی بات نہیں ہے بلکہ مجھے تو آکسفورڈ اور خاص طور پر انکل اظہر کا کالج بہت اچھے لگے ہیں۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"I am definately in love with this place."

میں نے قدرے جوش سے کہا تو پاپا مسکراتے ہوئے بولے:

"Oh! love at first sight."

''آکسفورڈ کی محبت میں گرفتار ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔یہ برطانیہ میں قدیم طرز کا بہت خوبصورت شہر ہے ہر طرف ہریالی ،سبزا اور رنگارنگ پھولوں سے گھرا ہوا یہ شہر پہلی ہی نظر میں دل کے تاروں کو چھو لیتا ہے۔''

پاپا بڑی محویت سے آکسفورڈ کے بارے میں بتا رہے تھے جب کہ میری نگاہیں روانی سے بہتے ہوئے دریائے ٹیمز پر مرکوز تھیں جو اس شہر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے کئی حصوں میں تقسیم ہو کر دریائے ٹیمز آکسفورڈ شہر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا۔

وقت کا پہیہ گھوم کر پھر پیچھے کی طرف چلا گیا۔

کالجوں کے شہر میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ نئے اور پرانے سٹوڈنٹس کا جم غفیر، ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ آپس میں باتیں کرتے تو کہیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، کوئی بریف کیس اٹھائے تو کوئی کمر پر Ruksack لادے اپنے اپنے کالجز کی طرف رجسٹریشن کے لیے جا رہے تھے۔فٹ پاتھوں پر بھی کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔

سڑک پر سائیکلوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ گروہ در گروہ اسٹوڈنٹس سڑک کراس

کرنے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ سڑک کا کچھ حصہ پیدل چلنے والوں کی حفاظت کے پیش نظر بند کر کے ٹریفک کو Divert کر دیا گیا تھا۔

''اس منظر کو دیکھنے کے لیے تو میں نے کئی سال انتظار کیا تھا۔'' میں نے خود سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس منظر کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھ کے کیمرے کے ذریعے ذہن کی البم میں محفوظ کر لوں۔ اس سے پہلے کہ یہ لمحہ وقت کی وسعتوں میں گم ہو کر ماضی کی ایک یاد بن کر رہ جائے۔

رجسٹریشن کے لیے کافی دیر سے طویل قطار میں کھڑے میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ایک لڑکی مجھ سے آ کر بری طرح ٹکرا گئی۔ میں تقریباً گرتے گرتے بچا اور ماضی کی گرفت سے نکل کر زمانہ حال میں واپس آ گیا۔

"I am so sorry."

شرمندگی کے ملے جلے تاثرات اور خاصے گھبراہٹ بھرے لہجے میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی کہہ رہی تھی۔

وہ مزید کچھ کہنے کے لیے ابھی مناسب الفاظ کی تلاش میں تھی کہ میں نے پہل کر کے اسے اس پریشانی سے نجات دلا دی۔

''آپ کو رجسٹریشن کروانے کے لیے قطار کے بالکل آخر میں جا کر کھڑے ہونا چاہیے۔'' میں نے اپنی دانست میں اسے مفت مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں...... دراصل ہمارا ایڈمشن تو سینٹ ہلڈا (St. Hilda) کالج میں ہوا ہے لیکن ہم نے اس کالج کی خوبصورتی کے اس قدر چرچے سن رکھے تھے کہ ہمارا دل چاہا کہ اپنے کالج میں جانے سے پہلے ہم ایک نظر اس کالج کو دیکھ لیں۔'' سیاہ آنکھوں نے

وضاحت کی۔

"Oh! all women college!" میں نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔

دراصل سینٹ ہلڈا آکسفورڈ کا وہ واحد کالج تھا جو صرف خواتین کی تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص تھا اور وہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

طویل قطار میں میرے ساتھ ہی کھڑا جیک جس سے میری کچھ دیر پہلے ہی جان پہچان ہوئی تھی، سیاہ آنکھوں کی بات سن کر قہقہہ لگاتے لگاتے رہ گیا۔ جیک کے اس تمسخرانہ انداز پر لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ مزید پھیل کر اپنی دوسری ساتھی لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"This is Tina from Banglore."

سیاہ آنکھوں نے اپنی شوخ وشنگ ساتھی لڑکی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"I am Jill from Bristol."

دوسری لڑکی نے قدرے سنجیدگی سے خود ہی اپنا تعارف کروا دیا۔

''آپ کا بھی کوئی نام ہے کہ نہیں؟'' میں نے سیاہ آنکھوں سے پوچھا۔

''اوہ سوری! میں سوسن ہوں۔'' خوبصورت نام ہے میں نے دل میں سوچا۔

اتنی دیر میں جیک نے جل سے خود ہی اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا تھا۔

کالج کے بے پناہ رش میں اسٹوڈنٹس کی لمبی قطاروں میں سے راستہ بنا کر ان تینوں کو گیٹ تک لیجاتے لیجاتے کافی وقت لگ گیا۔

تینوں کے چہروں سے فکرمندی صاف جھلک رہی تھی کہ کہیں وہ اپنی رجسٹریشن کے لیے لیٹ نہ ہو جائیں۔

گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے سیاہ آنکھوں نے پوچھا ''آپ کا بھی کوئی نام تو ہو گا؟''

میں نے آداب بجالاتے ہوئے جواب دیا ''سلمان شاہ'' اور وہ مسکراتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

ہم سب کی پہلی ملاقات جلد ہی بڑی گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی جس نے بعد میں ہم سب کی زندگیوں کے راستے متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ہماری ملاقات شروع شروع میں تو صرف ویک اینڈ پر ہی ہوا کرتی تھی پھر جیسے جیسے دوستی کی گرہ مضبوط ہوتی گئی ہفتے کے دوران بھی شام کو اکثر ہم کسی قریبی کیفے ٹیریا میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

اس عرصے میں بے حد باتونی جیک اور خاموش سی جل میں کافی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن ان کی دوستی کچھ ہاٹ اینڈ کولڈ قسم کی تھی۔ جب ملتے تو لگتا تھا کہ دو ہنسوں کا یہ جوڑا اب کبھی بھی جدا نہیں ہوگا۔ پھر جیک اچانک کچھ بتائے بغیر کئی کئی دنوں کے لیے غائب ہو جاتا۔

نظر آتا تو کینٹین، بار، کامن روم یا کالج کے لان میں کسی نہ کسی کے ساتھ کمیونزم، کیپٹلزم اور سوشلزم پر لمبی لمبی بحثیں کر رہا ہوتا۔

اتنی لمبی غیر حاضری کے بعد جل جب بھی جیک کو دیکھتی تو اس کی بہت سی معذرتوں کے جواب میں صرف شٹ اپ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا کرتی تھی۔

اس کے برعکس ٹینا کی رگ مزاح دونوں کو دیکھ کر پھڑک اٹھتی تھی کہ آخر یہ کوئی لڑائی جھگڑا کیوں نہیں کرتے اور جل کیوں ہمیشہ خاموشی سے جیک کی معذرت قبول کر لیتی ہے۔

ایسے میں شرارت سے ٹینا

Jack and Jill went up the hill to fetch a pill of water....

لہک لہک کر گانا شروع کر دیتی۔

وہ واٹر کی آر کو اس قدر لمبا کر دیا کرتی تھی کہ وہ دونوں غصہ کرنے کی بجائے کھلکھلا کر اس زور سے ہنستے کی ان کی آنکھوں میں پانی آجاتا تھا۔

ایسے میں سوسن ہنستے ہنستے لقمہ دیتی ”بس کرو ٹینا اب بالٹی کا سارا پانی تو ان کی آنکھوں کے رستے بہہ نکلا ہے۔“

اس کے برعکس سوسن اور میرے درمیان بحث و تکرار شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم ذہنی طور پر کافی قریب آ چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی اس ذہنی ہم آہنگی کا ہی نتیجہ تھا کہ ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے بہت زیادہ لفظوں کی ضرورت پیش نہیں آیا کرتی تھی۔

یونیورسٹی کے ہنگاموں اور ہماری نوک جھونک میں سنہرے سنہرے سے دن اور جھلملاتی ہوئی شامیں دبے پاؤں گذرتی جا رہی تھیں۔

اب اکثر شام کو سوسن، جل اور ٹینا ہمارے ہال میں آنے لگی تھیں۔ ایڈیسن ریور سائیڈ پر چہل قدمی کرتے، ادب اور فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے، ڈیر پارک کا نظارہ کرتے کرتے وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

بنگلور کی رہنے والی ٹینا کو ہرنوں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔

وہ جب بھی ہمارے ہال میں آتی کتنی ہی دیر تک پارک کی ریلنگ سے لگ کر خاموشی سے ہرنوں کو دیکھتی رہتی تھی اور اگر کوئی ہرن قدرے قریب آ جاتا تو وہ ایک ادائے دلبری سے یہ شعر پڑھ کر بیچارے کا دل توڑ دیتی۔

تو میرے ساتھ کہاں تک چلے گا میرے غزال
میں راستہ ہوں مجھے شہر سے گزرنا ہے

ایسے میں سوسن ہرن کے بچاؤ کے لیے میدان میں کود پڑتی۔

''یار بس کر ٹینا یہ ہرن تیری شاعری وائری نہیں سمجھتا۔''

''ارے جانے بھی دو۔'' ٹینا تنک کر کہتی۔

''کیوں نہیں سمجھتا! آدھی سے زیادہ اُردو شاعری تو اسی غزال کے دم سے ہے۔غزال نہ ہوتا تو غزل کہاں سے آتی؟ اور یہ جو شاعر لوگ محبوب کی آنکھوں کو اس کی غزالی آنکھوں سے تشبیہ دیتے نہیں تھکتے ایک دم بانجھ ہو جاتے۔''

''واہ واہ کیا زبردست نقطہ ہے۔تالیاں......تالیاں۔''

ایسے میں جیک اور میں دونوں مل کر تالیاں بجانے لگتے۔

''چلو کم از کم تم اسے بوائے فرینڈ ہی بنا لو۔کہیں غزال یہ نہ کہتا پھرے کہ پھرتے ہیں مہ خوار کوئی پوچھتا نہیں۔''

ایسے میں سوسن بھی میرے اور جیک کے ساتھ شامل ہو جاتی مگر جل پھر بھی کچھ کہے بنا گہری گہری نظروں سے صرف جیک کو دیکھتی رہتی تھی۔

شعر و شاعری کا شوق ٹینا کو ورثے میں ملا تھا۔اس کا تعلق بنگلور کے ایک نہایت علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔اس کے والد ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ٹینا خود تو شعر نہیں کہتی تھی مگر سخن فہم اور سخن شناس ضرور تھی۔ بہت سے اردو اور ہندی کے شعراء کے سینکڑوں اشعار اُسے زبانی یاد تھے جو وہ موقع بہ موقع اچھالتی رہتی تھی۔

ایسے میں جیک اور جل ہونقوں کی طرح ٹینا کا منہ تکا کرتے تھے پھر وہ انگریزی میں ٹرانسلیٹ کر کے شعر کا مطلب دونوں کو سمجھایا کرتی تھی۔

اب پھر جیک کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد اچانک وارد ہوا تھا جس سے جل اُس سے کافی ناراض دکھائی دے رہی تھی۔

زیادہ تر خاموش رہنے والی جل آج جیک کی کمیونزم، سوشلزم اور کیپٹلزم پر دھواں دھار تقریر سے تنگ آ کر بولی:

"جیک کسی نئے نظام کی بات کرو۔ یہ سب نظام ناکام ہو چکے ہیں کیونکہ یہ سب استحصالی نظام تھے۔ دنیا میں کہیں مساوات نہیں ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کو ہی لوٹنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔"

جیک جل کو قدرے بے یقینی سے دیکھنے لگا مگر کچھ بولا نہیں۔

"شکر ہے اس کی تقریریں سن سن کر اس کے امیر کبیر باپ نے اپنی ساری دولت غریبوں میں دان نہیں کر دی۔" ٹینا، جل کی حمایت میں بول اٹھی۔

"جیک ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی ہر وقت ایک ہی موضوع پر بات کرنا پسند کرے۔ ہر شخص کو اپنا نقطہ نظر رکھنے کی آزادی ہے۔ الگ الگ Socio-Cultural ماحول میں پروان چڑھنے کے سبب ہر ایک کی سوچ مختلف ہوتی ہے جس کا احترام کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جل سیلانی طبیعت والے من موجی سے جیک کو سمجھانے والے انداز میں کہتی تو جیک کا جوش قدرے دھیما پڑ جاتا۔

"اور پھر جینڈر ڈیفرنسز (Gender Differences) کی وجہ سے مرد اور عورت کے سوچنے کا انداز الگ ہے۔"

جل کے اتنا کہتے ہی ٹینا بول اٹھتی:

"Women are from Venus and men are from the Mars."

"یار ہر بات میں فیمینزم کا جھنڈا الہرانا ضروری ہے کیا؟"

جیک بڑی بیزاری سے سوال کرتا۔

''یہ تم سلمان شاہ سے پوچھو۔'' ٹینا جلدی سے جواب دیتی۔

''بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں؟ یار اپنی اس فیمینزم کی بحث میں تم دونوں مجھے مت گھسیٹو۔'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔

جیک دراصل ایک امیر کبیر ارسٹوکریٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کئی پشتوں سے کارنوال کے علاقے میں آباد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کو ایک بڑی جاگیر کے علاوہ کئی شاہی القابات وخطابات سے نوازا گیا تھا۔

برطانیہ کی سیاست میں ان کا خاندان کافی سرگرم تھا۔ ہاؤس آف لارڈز میں اُن کی موروثی نشست تھی۔

جیک کو اوائل عمر سے ہی برطانوی شرفاء کے رسم و رواج کے مطابق ملک کے مہنگے ترین بورڈنگ سکول ٹان برج (Ton Bridge) میں داخل کروایا گیا تھا جہاں وہ شاہی خاندان کے کئی افراد کے علاوہ ایلیٹ کلاس کے بچوں کے ساتھ پڑھتے اور کھیلتے کودتے بڑا ہوا تھا۔

لیکن جیک کو اپنے پُرشکوہ خاندانی شجرے اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے خاصی چڑ تھی اس لیے وہ اس کا ذکر بہت کم کیا کرتا تھا۔

ایک امیر زادے کی طرح انتہائی ناز و نعم میں پل کر جوان ہونے کے باوجود جیک کی طبیعت میں فطری سادگی تھی۔ ہر قسم کے نمود و نمائش سے وہ کوسوں دور بھاگتا تھا لیکن اُس کے ارسٹوکریٹک نقوش، چال ڈھال میں تمکنت اور وقار کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ میں تہذیب وشائستگی کی جھلک اس کی خاندانی وجاہت کی چغلی کھائے بغیر نہیں رہتے تھے۔

''جیک اپنے ڈیڈ سے یونیورسٹی اخراجات کے علاوہ ایک پائی بھی نہیں لیتا اور

اپنے غیر تعلیمی اخراجات پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم کام کر کے پورے کرتا ہے۔"

ایک دن جل نے جیک کی غیر موجودگی میں انکشاف کیا تو ہم اس نوابزادے کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو ایسا خاندانی پس منظر رکھنے کے باوجود آکسفورڈ کے گلی کوچوں میں ایک معمولی سی بائیک پر بڑے اطمینان سے پیڈل مارتا ہوا نظر آتا تھا۔

آج جیک پھر کئی دنوں کے بعد نظر آیا تھا۔ ہاتھ میں کئی کتابیں پکڑے ہوئے وہ لان کے اس کونے کی طرف آ گیا جہاں ہم چاروں بیٹھے ہوئے گرمیوں کی سہ پہر میں کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

وہ ہمارے پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ہم سب جانتے تھے کہ جیک سے یہ سوال پوچھنا ہی بے کار تھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھا؟ کیونکہ اس کا یوں اچانک ٹرم ٹائم میں ایک دو بار گم ہو جانا اب ہمارے لیے ایک معمول کی بات بن چکی تھی۔

جیک کو خاموش پا کر میں نے ہی بات کا آغاز کیا۔

"کیا آج کسی ازم پر بات نہیں ہو گی؟" میں نے جیک کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، آج لٹریچر پر بات ہو گی۔ فلسفے پر بات ہو گی۔ آج افلاطون، نطشے، کانٹ اور ہیگل پر بات کریں گے۔" جیک نے متانت سے جواب دیا۔

نطشے کے نام سے سوسن کو سخت چڑ تھی۔ ایک دم بول اٹھی "ارے وہی مجذوب فلسفی جو اپنے قلبی واردات کا صحیح ادراک نہ کر سکا اور بھٹک گیا۔"

تمہارے اسی نطشے کے لیے اقبال نے کہا تھا نا، ٹینا نے شعر جڑ دیا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھتا مقام کبریا کیا ہے!

سوسن اور ٹینا کو نطشے کی مخالفت پر کمر بستہ دیکھ کر جیک نے فلسفے پر بات چیت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''تو چلو آج لٹریچر پر بات کر لیتے ہیں۔'' جیک نے بڑے صلح جویانہ لہجے میں تجویز پیش کی۔

''آپ ٹالسٹائی سے ملاقات کرنا چاہیں گی یا میکسم گورکی کی عزت افزائی فرمائیں گی وگرنہ تو دوستوفسکی، پشکن، چیخوف اور گوگول ہاتھ باندھے ہوئے دربارِ عالیہ میں حاضری کے منتظر ہیں۔''

جیک کے اس ظریفانہ انداز گفتگو پر جل جو کافی دیر سے روٹھی روٹھی سی بیٹھی ہوئی تھی ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ تم رشین لٹریچر کا پیچھا کب چھوڑو گے جیک؟'' ٹینا نے جل کر سوال کیا۔

"Never" جیک جو رشین ادب کا شیدائی تھا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اگر عالمی ادب میں سے رشین لٹریچر کو نکال دیا جائے تو پھر باقی پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟'' اس نے ٹینا پر اپنی دانست میں زبردست وار کیا۔

''بہت کچھ۔'' ٹینا نے جلدی سے جواب دیا۔

''چیکوسلواکیہ کا فرانز کافکا، آئرلینڈ کا جیمز جوائس اور فرانس کا ژاں پال سارترے عالمی ادب کے افق پر عہد ساز ادیبوں کی حیثیت سے طلوع ہوئے ہیں۔ کیا تم

ان کی اہمیت سے انکار کر سکتے ہو؟''

''آل رائٹ، آل رائٹ۔'' جیک نے جیسے سرنڈر کرتے ہوئے کہا۔

''سارترے بیسویں صدی کی عظیم ادبی شخصیت ہے۔ وہ ایک فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل لے کر پیدا ہوا تھا اور تاریخ علم و ادب میں اتنی بڑی سطح پر یہ واقعہ تیسری مرتبہ پیش آیا ہے۔ افلاطون اور نطشے کے بعد اب سارترے کی شخصیت بھی فلسفے کے بلند امتزاج کی علامت بن گئی ہے۔'' ٹینا نے اپنی بات کے حق میں مزید دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''زندہ وجود کی اہمیت پر سارترے کے فلسفہ زیست پر تو کوئی باشعور شخص اعتراض کر ہی نہیں سکتا۔'' ٹینا جو سارترے کے عشق میں مبتلا تھی اپنی ہی دھن میں بولے چلی جارہی تھی۔

دراصل جیک اور ٹینا کی ادبی نوک جھونک کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ہی فلسفہ اور عالمی ادب میں جوائنٹ آنرز کر رہے تھے جبکہ میرا مضمون معاشیات تھا۔ سوسن اور جل نفسیات کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اس لیے ان دونوں کے بحث مباحثہ میں ہم صرف ایک خاص حد تک ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

یہ جیک سے ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ گریجویشن مکمل کئے بغیر ہی وہ اچانک، پھر غائب ہو گیا۔ اب کی بار اس کی غیر حاضری کافی طویل ہو گئی تھی۔ ہم سب اس کی طرف سے خاصے فکرمند تھے کیونکہ جیک نے ہم میں سے کسی سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔

جل بھی ایک گومگو کی کیفیت میں تھی کہ آخر جیک کو کیا ہوا؟ وہ اچانک کیوں غائب ہو گیا؟ اور اب فائنل ایئر کے امتحانات سر پر آ گئے تھے مگر جیک کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ہم سب تتر بتر ہو گئے۔ سوسن اور میں لندن چلے گئے اور ٹینا واپس بنگلور۔

سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف یوں لوٹ چکے تھے جیسے پرندے سارے دن دانہ دنکا چگنے کے بعد شام کو اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں۔

سوائے جِل کے جو آکسفورڈ میں رک کر ہی جیک کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آکسفورڈ کے کسی کالج میں ریسرچ فیلوشپ حاصل کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جیک ایک دن ضرور واپس آئے گا اور سینٹ ہلڈا کالج کے باہر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرے گا اور اگر وہ چلی گئی تو وہ اسے وہاں نہ پا کر سخت مایوس ہو گا۔

بظاہر لاتعلق اور خاموش سی رہنے والی جِل کے جذبوں کی گہرائی دیکھ کر ہمارے سر اُس کے سامنے عقیدت سے جھک گئے۔

"جیک بہت خوش قسمت ہے جو اسے جِل جیسی لڑکی ملی ہے ورنہ مغربی معاشروں میں ایسی وفاداری کی مثالیں تو نہ ہونے کے برابر ہی ہیں۔" ٹینا نے جِل کے فیصلے سے متاثر ہو کر کہا۔

آخری ملاقات پر ہم سب ہی اُداس تھے۔ جیک کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ الوداعی بوسے دیتے ہوئے ٹینا نے فرازؔ کے شعر کا مصرعہ دہرا دیا:

ع اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے

"خدا نہ کرے۔" سوسن نے بڑی بوڑھیوں کے سے انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ ہم سب اداس چہروں کے ساتھ زور سے ہنس پڑے۔

"پاپا اب آپ تیاری شروع کریں۔ ہمیں شام کو تھیٹر بھی جانا ہے۔"

میں جو اتنی دیر سے آنکھیں موندے ہوئے پڑا تھا شعاع کی آواز مجھے واپس

ہوٹل کے کمرے میں لے آئی۔

''ابھی تو کافی وقت ہے جانے میں۔'' سوسن نے واش روم سے نکلتے ہوئے کہا۔

جیک کے بارے میں سوچ کر مجھ پر کچھ اداسی سی طاری ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی سوچوں کا رُخ موڑنے کی غرض سے ٹی وی آن کر دیا۔

بی بی سی پر وار ویٹرنز (War Veterans) کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس وقت بات چیت عراق کی جنگ سے واپس آنے والے امریکی اور برطانوی فوجیوں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی صحت کے حوالے سے ہو رہی تھی کہ کس طرح وہ جنگ سے واپس آ کر گوناگوں ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ڈاکومنٹری کافی ڈسٹربنگ لگ رہی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ میں ان فوجیوں کے متعلق کچھ ہارڈ فیکٹس (Hard Facts) کے علاوہ ویٹرنز کے فیملی ممبرز کے انٹرویوز بھی دکھائے جا رہے تھے۔

امریکہ میں ڈیپارٹمنٹ آف ویٹرن افیرز (V.A) کا نگران آفیسر بتا رہا تھا کہ ''تقریباً %49 ویٹرنز جنگ سے واپسی پر شدید دماغی صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر 65 سیکنڈ میں ایک فوجی خودکشی کر رہا ہے اس طرح اندازاً کم از کم 22 فوجی روزانہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔''

اب ایک کلینکل سائیکالوجسٹ کسی ریسرچ کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ:

"After experiencing a severe trauma or life threatening event, many veterans develop PTSD symptoms."

یہ PTSD کیا ہے؟ پیش کار نے سوال کیا۔

PTSD کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سائیکالوجسٹ نے بتایا ''افغانستان اور عراق سے واپس آنے والے بہت سے فوجیوں میں PTSD کی علامات پائی گئی ہیں۔ PTSD یعنی پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈس آرڈر (Post Traumatic Stress Disorder) کے مطابق جنگ کے دوران پیش آنے والے ہولناک واقعات اور شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ انسانی ذہن پر بہت منفی اثرات مرتب کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔جس کا صحیح اندازہ اس وقت تو نہیں ہو پاتا مگر حالت جنگ سے باہر آ کر جب آپ ایک نارمل لائف اسٹائل میں آتے ہیں تو اس کی علامات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں۔یعنی کہ ڈیلیڈ ری ایکشن (Delayed Reaction)۔

بی بی سی پیش کار نے پھر سوال کیا'' کیا وجہ ہے کہ کچھ ویٹرنز تو PTSD کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ نہیں بھی ہوتے؟''

''اس کے بارے میں تو وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن PTSD کی علامات ظاہر ہونے کا دارومدار کافی حد تک اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ ایک فوجی نے جنگ میں کتنی مرتبہ شمولیت اختیار کی اور کتنی لڑائیوں میں حصہ لیا۔''

سائیکالوجسٹ نے نپا تلا سا جواب دیا۔

اب سائیکالوجسٹ کے ساتھ ساتھ ایک کمیونٹی جنرل پریکٹشنر (GP) بھی گفتگو میں شامل ہو گیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ'' اس کے پاس آنے والے ویٹرنز جس قسم کے مسائل کا اظہار کرتے ہیں ان میں لگاتار منفی خیالات کا آنا، ڈراؤنے خواب، فلیش بیک جیسے کہ میدان جنگ کے ہولناک واقعات ابھی بھی وقوع پذیر ہو رہے ہوں یا پھر بے خوابی۔ دل کی دھڑکن کا تیز ہونا، جسم کی حرکت کا قابو میں نہ رہنا، شدید قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ کے دورے پڑنا جس میں سینے میں درد کے ساتھ ساتھ سانس رکتا ہوا محسوس ہونا۔''

سائیکالوجسٹ نے دوبارہ گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا کہ ''PTSD کی علامات (Symptoms) عموماً مختلف لوگوں کومختلف انداز میں متاثر کرتی ہیں لیکن عموماً ویٹرنز میں پائی جانے والی علامات چار طرح سے ظاہر ہوتی ہیں۔

جن میں پہلی علامت کو ہم "Re Current" کہتے ہیں جس میں شدید ذہنی اور جذباتی صدمے والے واقعات آپ کو بار بار یاد آتے ہیں۔

دوسری صورت "Extreme Avoidance" کی ہوتی ہے جس میں آپ لوگوں، جگھوں یا ایسی سچویشن سے اجتناب برتتے ہیں جس سے منفی یادیں سر اٹھا سکتی ہوں۔ اس رویے کے نتیجے میں آپ ہر چیز میں دل چسپی کھوتے چلے جاتے ہیں۔

تیسری علامت "Negative Change" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس میں آپ کے خیالات اور موڈ میں زبردست تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور آپ اپنے اور دوسروں کے بارے میں بہت منفی خیالات کے ساتھ ساتھ ایک مستقل خوف و ہراس، احساس جرم اور شرمندگی کی کیفیت میں گرفتار رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ پورے معاشرے سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھی صورت میں آپ "Emotionally Reactive" ہو جاتے ہیں جس میں ہمہ وقت چوکنے رہنا، معمولی معمولی باتوں پر خوفزدہ ہو کر اچھل پڑنا، چڑچڑا پن، شدید غصے کے دورے پڑنا یا پھر بہت ہی غیر ذمہ دارانہ ردعمل کا مظاہرہ کرنا۔ ذہنی یکسوئی نہ ہونا اور ہر وقت ایک عدم تحفظ کے تحت جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر ہائی الرٹ کیفیت میں رہنا شامل ہے۔''

پیش کار نے ساری گفتگو کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ جنگ سے واپسی پر PTSD کی علامات کبھی کبھار تو مہینوں بلکہ سالوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تلخ یادیں وقتاً فوقتاً سر ابھارتی رہتی ہیں مگر آپ کو ڈس فنکشنل (Disfunctional) نہیں کرتیں لیکن اگر

آپ کی روزمرہ زندگی بسر کرنے کی اہلیت شدید طور پر متاثر ہو رہی ہے تو پھر بہت ممکن ہے کہ آپ PTSD کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں آپ کو مدد کے لیے ضرور رجوع کرنا چاہیے۔

میں، سوسن اور شعاع دم سادھے ہوئے ڈاکومنٹری دیکھ رہے تھے۔ طبیعت ایک دم بوجھل سی ہو چکی تھی۔

''کس قدر افسوس ناک صورت حال ہے۔'' سوسن نے افسردگی سے کہا۔

''بے گناہ انسانوں پر ظلم کرنے کے بعد جب احساس جرم کے کیڑے روح پر رینگتے ہیں تو PTSD تو کیا اس سے بڑی عفریت بھی جسم وجاں پر نازل ہو سکتی ہے۔'' شعاع نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم ٹھیک سے اپنے خیالات و تاثرات شیئر بھی نہیں کر پائے تھے کہ چند فیملیز کے ساتھ انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک خاتون بتا رہی تھی کہ ''اس کا شوہر عراق جنگ سے واپسی پر ایک نارمل فیملی لائف گذارنے کے قابل نہیں رہا۔ راتوں کو اکثر ڈر کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کمرے میں ادھر اُدھر دیکھتا اور کونے کھدروں کی تلاشی لینی شروع کر دیتا ہے۔ بیڈ کے نیچے جھانکتا ہے۔ الماری کھول کر دیکھتا ہے۔ تکیے کے نیچے سے اپنی گن تلاش کرتا ہے اور کچھ نہ پا کر پسینہ پسینہ ہو کر کمرے کے وسط میں بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کے چاروں طرف یوں دیکھتا ہے جیسے وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں بلکہ ابھی تک میدان جنگ میں دشمن کے ساتھ مقابلے میں مصروف ہو اور پھر زور زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔''

اب خاتون باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں لیکن اس نے جلد ہی حوصلہ مجتمع کر کے رومال سے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پونچھا اور دوبارہ بات کرنے لگ گئی۔

''رفتہ رفتہ اس نے گھر سے غائب ہونا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ تو میں نے اُسے گھر سے باہر پڑے کوڑے دان (Wheely Bin) میں چھپے ہوئے ڈھونڈھ کر نکالا ہے۔ وہ کوڑے دان میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے بعد تھوڑا سا ڈھکنا اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتا تھا جیسے کہ میدان جنگ میں دشمن کی بو سونگھ رہا ہو اور پھر ڈھکنا بند کر کے چھپ کر بیٹھ جاتا تھا۔ گویا ابھی تک کم بیٹ (Combat) پوزیشن میں ہو۔''

پیش کار نے خاتون کو دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا کہ اس نے اپنے شوہر کو کسی V.A سنٹر میں ٹریٹمنٹ کے لیے ریفر کیوں نہیں کیا؟

''کیا تھا۔'' خاتون نے جواب دیا لیکن جیک کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس میں زندہ رہنے کی خواہش ہی مر چکی ہے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے قیامت خیز منظر اس کی آنکھ کی پتلی میں جم چکے ہیں کہ وہ پہلے والا جیک ہی نہیں رہا۔'' خاتون بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

دفعتہً سوسن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ''اوہ مائی گاڈ یہ تو جل ہے، اور ہم اتنی دیر سے اسے پہچان ہی نہیں پائے۔ وقت نے کتنی بے رحمی سے اپنے آہنی پنجے اس کے چہرے پر گاڑ رکھے ہیں کہ اس کی شکل تک پہچانی نہیں جا رہی۔''

''جل جس قسم کے حالات کا شکار ہے اس میں اکثر لوگوں کے چہرے گم ہو جایا کرتے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

ٹینا کی کہی ہوئی بات آج یاد آ رہی تھی ''اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے''۔

''جیک نے واقعی جل کے یقین کی لاج رکھ لی۔'' سوسن نے کہا۔

''ہاں'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''تو جیک نے پڑھائی چھوڑ کر آرمی جوائن کر لی تھی، اسی لیے کچھ بتائے بغیر ہی غائب ہو گیا تھا۔''

میں اور سوسن ڈاکومنٹری دیکھنے کے بعد بہت افسردہ سے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

ایسی حالت میں ہمارا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ ہم کامیڈی شو دیکھنے کے لیے تھیٹر میں جائیں لیکن شعاع کی دل آزاری کے خیال سے ہم نے بادل نخواستہ اٹھ کر تھیٹر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

تھیٹر جاتے ہوئے سارا وقت میں اور سوسن، جیک کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے ''فلسفے کی گتھیاں سلجھانے والا اور ادب پر لمبی لمبی بحثیں کرنے والا نازک مزاج اور اصول پسند جیک، جنگ کی ہولناکیوں سے کس قدر دکھی ہوا ہوگا۔'' سوسن نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن اس سے زیادہ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ جن مہلک ہتھیاروں (Weapons of mass destruction) کو تباہ کرنے کی خاطر اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عراقیوں کو آزاد کرانے کے لیے وہ وہاں گیا ہوگا۔ ان ہتھیاروں کو وہاں نہ پا کر اور سیاست دانوں کے جھوٹ کا پول کھل جانے پر وہ کس قدر ذہنی اذیت سے دوچار ہوا ہوگا۔'' میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

''دراصل جیک انسان کے احترام اور اس کی آزادی پر یقین رکھتا تھا لیکن اپنے وہ عقائد و نظریات جنہیں اس نے زندگی بھر مقدس اور عزیز رکھا ان کی زبوں حالی اور بے توقیری دیکھ کر وہ کس قدر دکھی ہوا ہوگا۔ اس کی بے بسی کی انتہا دیکھنے کے لائق ہو گی۔''

سوسن نے نہایت دکھی آواز میں کہا اور پلکوں پر لرزتے ہوئے موتیوں کو رومال میں جذب کرنے لگی۔

جیسے تیسے کر کے شو ختم ہوا رات کافی بیت چکی تھی۔

تھیٹر سے باہر نکل کر تنگ سی گلی میں کھڑے ابھی ہم سوچ بچار کر ہی رہے تھے

کہ کس طرح ہوٹل پہنچیں کہ بکھرے ہوئے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی اور ملگجے کپڑوں کے ساتھ نشے میں دھت اس اجنبی شخص نے میری بیٹی شعاع کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ ذرا قریب آتا، ہلکا سا مسکراتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔ اس نے چند مرتبہ یہی حرکت کی تو میں نے شعاع کے قریب ہوتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

میرے اس طرح دیکھنے پر وہ گلی کی دوسری نکڑ کی طرف چلا گیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکھڑاتا ہوا واپس آ گیا۔

"I am sorry my Princess..... I am sorry..... I am sorry my Princess..... I have not done anything..... I am really sorry."

وہ شعاع کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تقریباً آدھا جھکا ہوا یوں سوری سوری کہہ رہا تھا جیسے موت سے بچنے کے لیے وہ گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی اپیل کر رہا ہو۔

اجنبی کا اندازِ تخاطب اور آنکھوں میں اداسیوں کے ہزاروں صحراؤں کی ریت کی چبھن سے زیادہ جیسے اس کے ضمیر کی چبھن اس کی روح پر تازیانے برسا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آج سارے کا سارا ہی اپنی آنکھوں کے پیالوں سے جھپک جائے گا۔

آپ اس شخص کی درزیدہ کیفیت کچھ یوں سمجھ لیں کہ اگر کسی انسان کو زندہ ہی قبر میں اتار دیا جائے تو جیسے ہی قبر اس کے گرد شکنجہ کسنا شروع کرے تو وہ شخص وحشت و سراسیمگی کے عالم میں وہاں سے بھاگ نکلے۔ خوف و دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو جائے اور اس کی آواز حلق سے نکلنے کی ناکام کوشش میں ایک گھٹی گھٹی سی چیخ بن کر رہ جائے۔

انتہائی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا اپالو تھیٹر کے باہر اپنے گناہوں کی

اس انداز میں معافی طلب کرتا ہوا یہ اجنبی مجھے دنیا کا مفلس ترین شخص لگا۔

اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر بری طرح سے مسل رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھ سے سیدھا کھڑا کرتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا تو وہی برسوں پرانی کشادہ پیشانی، اٹھی ہوئی خاندانی ناک اور ذہین آنکھیں جن کی چمک گردش زمانہ سے ماند پڑ چکی تھی۔

میں نے تقریباً چیختے ہوئے جیک...... جیک کہنا شروع کر دیا۔

اس نے گھبرا کر مجھے اور سوسن کو بے یقینی سے دیکھا مگر اس کی نگاہیں کسی بھی پہچان سے کوسوں دور تھیں۔

''اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے۔'' ٹینا کی آواز کی بازگشت ایک بار پھر فضا میں گونج اٹھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔

○

مرد و زن کے لئے شرم و غیرت حیا لازمی ہے مگر
مرد جیسا بھی ہو آنکھ، میں عورتوں کی حیا ڈھونڈتا ہے

(رضیہ اسماعیل)

چھنال

''اری او چھنال...... کہاں مر گئی؟

مجال ہے جو اس رانڈ کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔ کب سے دو بوند پانی کے لئے ترس رہا ہوں۔''

بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں برگد کے درخت تلے پڑی کھاٹ پر، شام کے ملگجے سے اندھیرے میں بے حس و حرکت پڑا ہوا دیپو کافی دیر سے چلّا رہا تھا۔

''میری ٹانگوں میں دم ہوتا تو تیرے پیچھے جا کر اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑتا، سو جوتے مار کر، چٹیا سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرتا۔ ہائے رام اب میں کیا کروں!'' دیپو نے روہانسا ہو کر کہا۔

دیپو کی واہی تباہی نے سارے ماحول کو اداس سا کر دیا تھا۔

درخت پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی دن بھر دانہ دنکا چگنے کے بعد ستانا چاہ رہے تھے مگر دیپو کا واویلا سن کر سب ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

تھان سے بندھی گئیا بھی سب کچھ سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ وہ سامنے پڑے ہوئے چارے کو یوں حسرت سے تک رہی تھی جیسے ایک لاچار اور بے بس ماں اپنے جاں بلب بچے کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ کر امید اور نا امیدی کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ لیکن پھر جیسے اسے ایک ہڑکا سا لگے اور وہ ہڑ

بڑا کراپنی سوچوں سے باہر نکل آئے اور اپنے بچے کو بے اختیار چومنا شروع کر دے۔
گُڈیا بھی تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر بڑی بے چارگی سے چارے پر منہ مارنا شروع کر دیتی تھی۔
وقت نے جیسے سرگوشی کی ''مکان صرف چھتوں، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں، دالانوں، برآمدوں، ڈیوڑھیوں، آنگنوں اور ممٹیوں سے ہی قدر و منزلت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کا اصل شرف تو اُن کے مکین ہوتے ہیں۔''
بقول اسداللہ خان غالبؔ۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

اور اس مکان کا اصل شرف تو دیپو کی ماں ساوتری دیوی تھی جو بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مانگ سے سیندور پونچھ کر بیوگی کا سفید چولا پہن کر، ننھے سے دیپو کو سینے سے چمٹائے اس کی مسکراہٹوں کی لو سے ہی جیون کی سنسان اور تاریک راہوں کو روشن کرتی رہی مگر لب پر کبھی حرفِ شکایت نہ لائی۔
پارسائی کی ایک مثال بن کر جوانی کے کڑے کوس کاٹ دیئے۔ گاؤں کے بڑے بزرگ سب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ راہ چلتی ساوتری دیوی کو دیکھ کر سب ادب سے راستہ چھوڑ دیتے تھے، کیوں کہ ساوتری دیوی نے عزم و ہمت کی جوالا مکھی بن کر ناری جاتی کے مان سمبان کو جلا بخشی تھی۔ مجال ہے جو کبھی کمزور پڑی یا جھکی ہو۔ بس جیون بھر ترشول کی طرح تنی کھڑی رہی۔ جیسے وہ گوشت پوست کی عورت نہیں پتھر کی ایک چٹان ہو
لیکن کون جانے اس چٹان میں اندر ہی اندر کتنے جھرنے پھوٹ پھوٹ کر بانجھ ہو چکے تھے؟

دیپو کے سہرے کے پھول کھلنے اور گھر کے بڑے سے آنگن میں پوتے پوتیوں کی معصوم کلکاریاں سننے کے سپنے آنکھوں میں سجائے ہی ساوتری دیوی نے جیون کاٹ دیا۔

دیپو کے پتا نے چند بیگھے زمین چھوڑی تھی جس سے کسی کا احسان لیے بغیر اس کی گزر اوقات ڈھنگ سے ہو جاتی تھی۔

ساوتری دیوی نے ساتھ کے گاؤں میں ایک بھلے مانس گھرانا دیکھ کر دیپو کے لگن کی بات بڑھائی تو بس چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو گیا۔ ساوتری دیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ بیاہ کی تیاریوں کو دیکھ کر اگر کوئی دبی زبان سے کچھ کہتا بھی تو ساوتری دیوی ہنستے ہوئے کہتی، ''ارے، میری ایک ہی تو سنتان ہے، کون سے دس بارہ بچے ہیں جن کے بیاہ رچانے ہیں مجھے۔ میں تو دیپو کے بیاہ پر جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گی۔''

دیپو کا بیاہ اس قدر دھوم دھام سے ہوا اور بھوجن ایسا مزے کا تھا کہ گاؤں والے بہت دنوں تک انگلیاں چاٹ چاٹ کر چٹخارے لیتے رہے۔ دیپو اور جیوتی کی جوڑی سچ مچ دیپک اور جیوتی کے موافق ہی ثابت ہوئی۔ یک جان و دو قالب۔ دیپو تو جیوتی کو دیکھتے ہی اس پر جی جان سے فدا ہو گیا تھا۔ ماں کے صدقے واری جاتا تھا کہ کتنی اچھی جیون ساتھی ڈھونڈی اس کے لئے۔ دیپو اور جیوتی کے پریم کے چرچے رفتہ رفتہ گاؤں میں سب ہی کی زبان پر آ گئے۔

گاؤں کی کچی کنواریاں اکثر پنگھٹ پر ان کے پریم کے قصے سنا سنا کر مزے لیتیں اور پھر شرم سے دوہری ہو کر منہ ڈھانپ کر کھلکھلا کھلکھلا کر خوب ہنستیں۔

''چنتا نہ کرو جب تمھارا لگن ہو گا تو تمھارا پتی بھی ایسا ہی تمھارا دیوانہ ہو گا۔ مرد تو روپ اور جوانی کا بھوکا ہوتا ہے، شیر کی طرح تمھاری بوٹیاں نہ نوچ لے تو میرا نام بدل دیجیو۔'' شانتی موسی نے گویا رنگ روپ والی ساری کنواریوں کو چنوتی

دے دی۔

لگتا تھا ادھیڑ عمر شانتی موسی کو اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے تھے جبھی تو وہ بات کرتے کرتے لجا سی جاگئی۔

اُدھر ساوتری دیوی، دیپو اور جیوتی سے کوئی خوش خبری سننے کے لئے دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی۔ مندر میں چڑھاوے چڑھاتی۔ بس اس کا یہی ارمان تھا کہ دیپو کی سنتان کا منہ دیکھ لے تو سمجھے گی اس نے گنگا نہا لیا مگر ساوتری دیوی کے پاس وقت کم پڑ گیا۔ گاؤں میں اچانک ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی جس سے بہت سے لوگوں کی طرح ساوتری دیوی بھی دیکھتے ہی دیکھتے پرلوک سدھار گئی۔

ماں کی اچانک موت کا جانکاہ صدمہ دیپو کی برداشت سے باہر تھا۔ ماں کی چتا کو آگ دکھاتے ہوئے وہ یوں بلک بلک کر رویا کہ لگتا تھا کہیں چتا کی آگ اس کے آنسوؤں کی نمی سے وقت سے پہلے ہی ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

گہری اداسیوں میں ڈوبے ہوئے دیپو کو اپنی بکھری ہوئی ہستی کو سمیٹنے میں بہت وقت لگ گیا۔ ایسے میں جیوتی کی دل جوئی اور خاطر مدارات نے اس کے لئے مرہم کا کام کیا اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔

لگتا تھا دیپو اور جیوتی کی پرکشا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ٹریکٹر کی ٹکر سے دیپو ایسا زخمی ہوا کہ کمر کی چوٹ سے وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ جیوتی کے جیون کی تو جیسے جوت ہی بجھ گئی۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ جیوتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

ساوتری دیوی نے تقریباً ساری پونجی دیپو کی شادی پر لٹا دی تھی۔ کوئی مال دار سگا سمبندھی بھی نہیں تھا کہ روپے پیسے سے ان کی مدد کرتا تاکہ وہ دیپو کو شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جا کر علاج کرواتی۔ میکے میں لے دے کر رشتے کا ایک غریب ماما تھا

جس نے جیوتی کے ماتا پتا کے سورگ باشی ہونے کے بعد ان کی اکلوتی بٹیا کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اٹھائی اور مناسب بر دیکھ کر اس کا بیاہ کر دیا۔

جیوتی کے نصیب اچھے تھے کہ اس اناد کو ساوتری دیوی کا گھرانا مل گیا۔ دان دھیج لیے بنا ہی ساوتری دیوی نے اس کے ماما کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا جس پر غریب ماما بے حد پرسن تھا۔

ان حالات میں گاؤں کے وید سے ہی جو دوا دارو بن پڑتا تھا، جیوتی وہی کروا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ وہ دیپو کو جلدی اچھا کر دے۔

شروع شروع کے دنوں میں تو صدمے سے نڈھال اور مستقبل کی سوچوں سے پریشان جیوتی گُم سُم سی ہو کر دیپو کی کھاٹ سے ہی لگ کر بیٹھی رہی۔ نہ کھانا، نہ پینا، نہ بولنا، نہ ہنسنا۔ بس خالی خالی نظروں سے سب کو تکتی رہتی مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

جیوتی کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر چند روز تو محلے والوں نے اسے بھوجن کرا دیا مگر کب تک؟

دیپو کی بیماری نے بڑی سمسّیا کھڑی کر دی تھی۔ اب زمینوں پر کام کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ایک روز جیوتی کچھ سوچ کر اٹھی، ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے اور گاؤں کے مُکھیا کی حویلی جا پہنچی۔ مُکھیا یوں اچانک جیوتی کو حویلی میں پا کر قدرے حیران سا ہو گیا۔

''کہو، جیوتی! کیا بات ہے؟'' مُکھیا نے نرم لہجے میں جیسے ہی جیوتی سے بات کی، اس کے آنسو پھر سے پلکوں پر لرزنے لگے۔

''مالک، آپ تو دیپو کی حالت جانتے ہی ہیں۔ نہ جانے کب کھاٹ چھوڑے

گا وہ؟ زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا اب کوئی نہیں۔ اگر ابھی سے چارہ نہ کیا تو تمام کی تمام کھڑی فصل برباد ہو جائے گی۔ ایسے میں آشا کی کرن بس آپ ہی ہیں۔ کرپا کیجئے۔ اس وقت آپ ہی ہمارے لئے بھگوان ہیں۔"

جیوتی کی سچی اور سیدھی سادی باتوں نے نرم دل مُکھیا کا دل پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ دیپو کی ماں ساوتری دیوی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کے گھر کے حالات سن کر بہت دکھی ہوا۔ دیپو کے ٹھیک ہونے تک اس نے زمین کے سلسلے میں تمام کاموں کی ذمہ داری قبول کر لی اور بدلے میں فصل کا کچھ حصہ باقاعدگی سے جیوتی کو دینے پر رضا مندی ظاہر کر دی جس پر جیوتی نے سُکھ کا سانس لیا۔

اُدھر دیپو جیسا کڑیل جوان کھاٹ پر پڑے پڑے چند مہینوں میں ہی برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا۔ مزاج میں بہت زیادہ چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ چلتی پھرتی جیوتی کو دیکھ کر اس کے دل پر آرے سے چلتے تھے۔ جیوتی کا رنگ روپ، جس کا وہ کبھی دیوانہ تھا، اب اُسے کھلنے لگا تھا۔ دن رات جانے اَن جانے اندیشے اُس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔

جیوتی کی دن رات کی سیوا بھی اب اسے زہر لگنے لگی تھی۔ اسے لگتا کہ جیوتی اس پر ترس کھا کر سب کچھ کر رہی تھی۔ جب کہ جیوتی اپنا پتی پرمیشور دھرم نبھاتے ہوئے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

ایسے میں جیوتی کے کاموں میں سو سو کیڑے نکالنا اور بہانے بہانے سے اسے گالیاں دینا دیپو کا معمول بن چکا تھا جس سے گھر کا ماحول ہر وقت کشیدہ رہنے لگا تھا۔

دیپو کی حالت دیکھ کر جیوتی نے ہار سنگھار چھوڑ دیا۔ سادہ سی سوتی ساڑھی پہن لی۔ نہ کہیں آنا، نہ جانا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے جس سے دیپو اس

سے خوش ہو کر اسے وقت بے وقت کوسنے دینے سے باز رہے۔

''آخر اسے بھی ہمدردی کے دو بولوں کی ضرورت ہے۔ انسان ہے، کوئی پشو تو نہیں کہ جیسے چاہو ہانکتے چلے جاؤ۔''

پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو سہارا دیتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''ناری کا من کتنا بھی وشال ہو مگر مرد کی بداعتمادی سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

حالات کی سولی پر لٹکی ہوئی جیوتی کی ذہنی حالت اور اس کے دکھ درد سے دیپو قطعی بے خبر تھا۔

اِدھر کچھ دنوں سے جیوتی شام ہوتے ہی دیپو کو بھوجن کرا کر کچھ کہے سنے بنا ہی گھر سے خاموشی سے نکل جاتی اور رات گئے واپس لوٹتی۔ تب تک دیپو انتظار کرتے کرتے اور اسے کوسنے دیتے ہوئے سو چکا ہوتا تھا۔

آج پھر شام ہوتے ہی جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی، دیپو نے چھنال چھنال کی رٹ لگانا شروع کر دی۔

شام کے وقت گلی سے گزرنے والے سب ہی لوگ اب ان گالیوں کے عادی سے ہو چکے تھے۔

میں اور باپو بھی ہر شام مندر میں گیتا کے پاٹھ سے فارغ ہو کر واپسی پر گھر جاتے ہوئے اس گلی سے گزرا کرتے تھے۔ دیپو کی باتیں سن کر باپو کی تیوری پر بل پڑ جاتے اور وہ نہایت ناگواری سے اپنی ناک سکیڑ لیا کرتا تھا جیسے بدبو کا زبردست بھبکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا ہو مگر اس گلی سے گزرنا ہماری مجبوری تھی۔ کیوں کہ ہمارے گھر کو جانے والا ایک یہی قریبی راستہ تھا۔

میں اکثر باپو کے چہرے کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے ایڑیاں

اٹھا کر دیپو اور جیوتی کے گھر کی کچی چار دیواری کے پار جھانکنے کی ناکام کوشش کرتا تو باپو مجھے بڑی طرح جھڑک کر تیز تیز قدموں سے چلنے کا بھاشن دے ڈالتا۔

''ہر شام یہی ناٹک ہوتا ہے۔ اس عورت کے لچھن کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' باپو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہتا۔ لیکن مجھے کبھی ہمت نہ پڑی کہ میں باپو سے پوچھ سکوں کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے؟

میں اپنی عمر کی سمجھی اور ناسمجھی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آ جاتی تھیں مگر بہت سی باتیں بس سر کے اوپر سے ہی گزر جاتیں۔ ایسے میں ماں اور باپو کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو میرے سوالوں کا جواب دیتا۔ ماں تو پھر بھی کچھ بتا ہی دیا کرتی تھی جب کہ باپو کا جواب اکثر ''ہوں، ہاں'' میں ہی ہوتا جو میرے لئے بڑی الجھن کا باعث بنتا۔

باپو کافی عرصے سے گاؤں کے چھوٹے سے سکول میں ماسٹری کر رہا تھا اور اب وہ ریٹائر ہونے کے قریب تھا۔ کچھ مدت سے اس نے شام کو مندر میں گیتا کا پاٹھ بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ سکول کی نوکری چھوڑنے کے بعد گیان دھیان کی کوئی مصروفیت تو بنی رہے۔

ایک دن ماں کو رسوئی کے کام میں مصروف دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ جیوتی دیدی اور دیپو بھیا کے بارے میں کچھ پوچھوں۔ ماں سے سوال پوچھنے کا یہ وقت بہت اچھا ہوتا تھا، کیوں کہ کام کی مصروفیت یا شاید بے دھیانی میں ہی وہ میرے بہت سے الٹے سیدھے سوالوں کے کھرے کھرے جواب دے دیا کرتی تھی۔

''ماں! یہ چھنال کیا ہوتی ہے؟''

انہماک سے برتن مانجھتی ہوئی ماں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کہاں سے سنا ہے یہ تو نے؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی، ''دیپو

سے سنا ہو گا، ہائے رام! کیا کل جگ ہے، کہاں ساوتری دیوی اور کہاں یہ جیوتی ؟ خاندان کی ناک کٹوا دی اس نے تو۔ دیپو نے کھاٹ کیا پکڑی، یہ گلچھرے اڑانے لگی۔''

''ماں! بتاؤ ناں چھنال کیا ہوتی ہے؟''

''ارے چھنال بہت ہوشیار اور چالاک ناری کو کہتے ہیں۔'' ماں نے اپنی دانست میں بڑی بے ضرر سی وضاحت کی۔

''مگر ہوشیار ہونے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ باپو تو سکول میں ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ جیون میں ہر ایک کو ہوشیار ہونا چاہیے۔''

''ارے، میرا مطلب پڑھائی میں ہوشیار ہونے سے نہیں ہے۔'' ماں بولی۔

''تو پھر کیا مطلب ہے تمھارا؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ارے یہ کیا کورٹ کچہری کے وکیلوں کی طرح تم نے جرح شروع کر دی ہے؟'' ماں کچھ دیر کو رُک کر جیسے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولی،''یہ بہت ہی چالاک ، ہوشیار بلکہ چلتر ہن ناری کو کہتے ہیں جو مردوں سے آنکھ مٹکا کرتی پھرے۔''

''چلتر ہن''میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر ماں سے پوچھا۔

''ہائے رام! اب اس ناسمجھ کو کیسے سمجھاؤں کہ چلتر ہن ناری کیا ہوتی ہے؟'' ماں نے میرے پے در پے سوالوں سے زِچ ہو کر کہا۔

''چلتر ہن ناری وہ ہوتی ہے جو غیر مردوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتی پھرے اور پتی ورتا ہونے کے نام پر بٹہ لگائے۔''

''مگر میں نے تو جیوتی دیدی کو کبھی کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تو ہر وقت دیپو بھیا کی دیکھ ریکھ میں ہی جتی رہتی ہے۔'' میں نے جیوتی دیدی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا مگر ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر میں نے پھر سوال جڑ دیا۔ ''ماں اگر مرد دوسری عورتوں سے آنکھ مٹکا کریں تو کیا انھیں بھی چھنال کہتے ہیں؟''

اب کی بار ماں نے ترنت جواب دیا، ''نہیں نہیں، مرد تو گندے جوہڑ میں سو ڈبکیاں بھی لگا لے تو پھر پوتر کا پوتر ہی رہتا ہے۔ چھنال تو بس ناری جاتی ہی ہوتی ہے۔'' ماں نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مگر ایسا کیوں؟ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے قدرے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ بس سنسار میں ایسا ہی ریتی رواج ہے۔ ہم کون سے مہاتما ہیں جو سماج سدھار کرتے پھریں۔'' ماں نے میرے تابڑ توڑ سوالوں سے چڑ کر مجھے تقریباً جھڑکتے ہوئے کہا، ''کیا ناری بھون کھولنے کا ارادہ ہے تیرا، جہاں تو لوگوں کو بھاشن دے دے کر بتائے گا کہ کون سی ناری اچھی ہے اور کون سی بری؟''

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس اب جا، الٹے سیدھے سوالوں سے میرا سر نہ کھا۔'' اس کے ساتھ ہی سوال جواب کا سلسلہ گویا منقطع ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ماں کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔

مجھے سندر سی جیوتی دیدی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جب سے بیاہ کر ہمارے گاؤں آئی تھی اس کی ہنس مکھ طبیعت اور موہنی سی صورت نے سب کا دل موہ لیا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے وہ اکثر مجھے پاس بلا کر پیار کیا کرتی تھی اور کبھی کبھی کوئی میٹھی چیز بھی کھانے کو دے دیا کرتی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد میرا جی چاہا کہ میں جیوتی دیدی کے گھر جاؤں۔

باپو شہر گیا ہوا تھا اور شام سے پہلے گاؤں لوٹنے والا نہیں تھا۔ ماں کو کچھ بتائے بغیر ہی میں وہاں سے کھسک گیا وگرنہ وہ تو لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی اگر اسے اِس

بات کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں جیوتی دیدی کے ہاں جانے والا ہوں۔

آنگن میں قدم رکھتے ہی میری نظر جیوتی دیدی پر پڑی جو بڑی مشکل سے دیپو بھیا کی کھاٹ کو گھسیٹ کر برآمدے کی طرف لے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''ارے راجن! تم آج کہاں سے ٹپک پڑے؟ اچھا ہوا تم آ گئے، اِدھر آؤ۔ کچھ مدد کرو، دیکھو تمھارے دیپو بھیا کب سے آنگن میں سے برآمدے میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ آج دھوپ میں تپش کچھ زیادہ ہی ہے۔''

میں خوش خوش بھاگ کر گیا اور جیوتی دیدی کی مدد کرنے لگا۔

جیوتی دیدی بولتی جا رہی تھی۔ دیپو بھیا آنکھیں موندھے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا، بس بے حس و حرکت پڑے رہے۔

میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ''ساوتری نواس'' ایک گہری اداسی کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں گئیا چارے پر منہ رکھے خالی خالی نگاہوں سے ہر شے کو تک رہی تھی۔ یہ ساوتری دیوی کے دنوں کی گئیا تھی جس کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی مگر آج اس گھر کے مکینوں کو اپنی ہی بپتا پڑی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس بے زبان کے ناز نخرے کون اٹھاتا؟

دیپو بھیا کے کبوتر بھی چھتری پر حواس باختہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بھی دیپو کی بیماری پر غٹر غوں کرنا بھول چکے تھے۔

آنگن کے بیچوں بیچ تلسی کا پودا بھی اشک بار نگاہوں سے گئے وقتوں کی رونقیں یاد کر کے اداس ہو رہا تھا۔

برآمدے میں لٹکے ہوئے سنہری پنجرے میں گانی والا خوب صورت طوطا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پر پھڑ پھڑا کر ماحول کے سکوت کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ طوطا جیوتی اپنے میکے سے ساتھ لائی تھی۔ بس یہی ایک نشانی تھی میکے کی جسے دیکھ

کر جیوتی کا من شانت ہو جایا کرتا تھا۔ لگتا تھا کہ اب طوطا بھی دیپو کی طرح جیوتی سے بدگمان ہو چکا تھا۔ دن رات دیپو کی چھنال چھنال کی رٹ سن کر طوطا بھی جیوتی کو دیکھ کر چھنال چھنال کی گردان کرنے لگتا تھا جس سے جیوتی دل مسوس کر رہ جاتی کہ اب پنچھی بھی اسے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے بوڑھے برگد کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی گاہے گاہے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''یہ جیوتی ہر شام کہاں چلی جاتی ہے، دیپو کو بتائے بغیر؟'' ایک نے کہا۔

''یہ تو رام ہی جانے۔'' دوسرے نے آہستگی سے جواب دیا۔

''میں تو دیپو کی ہر روز کی ِکل ِکل سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' تیسرے پنچھی نے کہا۔ ''لگتا ہے اب کوئی اور ٹھکانا دیکھنا پڑے گا۔'' اس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ، اور ٹھکانا دیکھ تو سکتے ہیں مگر ہمارا اس آنگن اور برگد کے ساتھ ناتا بہت پرانا ہے۔'' ایک تجربہ کار پنچھی نے سنجیدگی سے کہا۔

''برے وقت میں کیا ہم بھی اس گھر کے مکینوں کا ساتھ چھوڑ دیں؟ سیانے پنچھی نے گویا سب کو سوال کی زد پر رکھ دیا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ پھر خود ہی بولا،'' ایسا کام صرف انسان ہی کر سکتے ہیں ، ہم پنچھی پکھیرو نہیں۔ ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے۔ انہی شاخوں پر بیٹھ کر پرارتھنا کریں گے کہ اس گھر کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ آئیں۔'' بوڑھے پنچھی کی بات سے سب کے سراسیمہ چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ان سب نے مل کر کچھ اس انداز سے چہچہانا شروع کر دیا کہ میں اور جیوتی دیدی سر اٹھا کر برگد کی شاخوں کو حیرانی سے تکنے لگے اور یہ سوچ کر مسکرا دیئے کہ شاید پرندوں کی چہچہاہٹ میں اچھے وقتوں کا سندیسہ ہو۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دیپو جیوتی کے چلتر کے قصیدے پڑھنا

شروع کر دیتا مگر جیوتی سنی اَن سنی کر کے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔

دونوں کے درمیان اب بات چیت بہت کم ہوگئی تھی۔

جیوتی اگر کبھی دیپو سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو اس کے جلے کٹے جواب سن کر خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی۔ اس نے پلٹ کر دیپو کی کڑوی کسیلی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیا تھا جیسے ایسا کرنے سے اسے اپنا دھرم بھرشٹ ہونے کا اندیشہ ہو۔

اِدھر کچھ روز سے جیوتی نے گاؤں کے مالشیئے کو دیپو کی کمر اور ٹانگوں کی باقاعدگی سے مالش کرنے کا کہہ دیا تھا۔ ہر دوسرے روز دینو کاکا ایک گھنٹے کے لئے دیپو کی مالش کرنے وقت پر پہنچ جاتا۔

پہلے پہل تو دینو کاکا کو دیکھ کر دیپو نے کچھ احتجاج کیا مگر پھر تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیئے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے دیپو اپنی ٹانگوں میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔

پھر ایک روز اس نے معجزاتی طور پر اپنے پاؤں کی انگلیوں کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مہینوں بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اس کے پاؤں کی انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے شک ہونے لگتا تھا کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں واقعی حرکت کر رہی تھیں یا یہ اس کا وہم تھا۔ مگر کئی بار آزمانے پر بھی واقعی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ والی دونوں انگلیاں ہل رہی تھیں۔ دیپو اس چمتکار پر حیران و ششدر تھا۔ اسے تو لگتا تھا کہ اب وہ جیون بھر کے لئے کھاٹ کا ہو کر رہ جائے گا مگر اس نے اِس بات کا ذکر نہ ہی دینو کاکا اور نہ ہی جیوتی سے کیا کیوں کہ اس کے من میں تو کچھ اور ہی پل رہا تھا۔

چند ہی ہفتوں میں اس کے دونوں پاؤں کی تمام انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ اب وہ اپنے دونوں پاؤں ہلا جلا سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں میں جیسے جان سی پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی دلی کیفیت کو چھپا رہا تھا۔

اب وہ جیوتی سے بھی بدظن نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اُسے کوسنے دیتا تھا۔ بس خاموش خاموش سا کھاٹ پر پڑا نیلے آکاش کو تکتا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

دیپو سوچ رہا تھا کہ ایک دن جب وہ بالکل بھلا چنگا ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو جیوتی کا پیچھا کر کے اسے رنگے ہاتھوں پکڑے گا اور اس چھنال کو جو ساری ساری رات گھر سے باہر رہ کر اپنے تن کی آگ بجھاتی تھی، ساری پنچایت کے سامنے ننگا کرے گا کیوں کہ اس نے ان کے خاندان اور اس کی سورگ باشی ماں کی نیک نامی پر کلنک لگا دیا تھا۔

دیپو اپنے مشن کی تکمیل کے بارے میں دن رات سوچتا رہتا تھا۔ جیوتی کو اب اس کی اس قدر گھمبیر خاموشی سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

''کیا بات ہے دیپو نہ اب برا بھلا کہتا ہے نہ ہی کوئی بات کرتا ہے۔ جو بھی کھانے کو دو خاموشی سے کھا لیتا ہے وگرنہ پہلے تو وہ غصے میں آ کر اکثر کھانے سمیت ہی برتن آنگن میں پھینک دیا کرتا تھا۔'' جیوتی دن رات انہی سوچوں میں ڈوبی ہوتی تھی مگر سوچ کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

جیوتی کو گھر سے باہر جاتے ہوئے آج چالیسواں روز تھا۔ اب دیپو کی ٹانگوں میں اتنی توانائی آ چکی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کر سکتا تھا۔

آج شام ڈھلے جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی، دیپو بھی آہستہ آہستہ قدموں سے قدرے فاصلے پر رہ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ جیوتی جیسی بدکار عورت کی پارسائی کا پردہ چاک کرنے جا رہا تھا۔

گھر سے کافی دُور بہنے والی ندی کے گھاٹ پر جا کر جیوتی رک گئی اور ندی کنارے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر پرارتھنا کرتے ہوئے اس پر رقت سی طاری ہو گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی مگر دیپو کو اتنے فاصلے پر ٹھیک سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

چندر ما کی چٹکی ہوئی چاندنی میں ندی کنارے بیٹھی ہوئی جیوتی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ جسے دیکھ کر ایک مدت کے بعد دیپو کا دل بھی پگھلنے لگا مگر جلد ہی اس نے خود پر طاری ہونے والی مدہوشی پر قابو پالیا۔

پرارتھنا ختم کرنے کے بعد جیوتی نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ پھر جیسے ہی وہ اٹھ کر واپس جانے کے لئے پلٹی تو اپنے پیچھے کھڑے دیپو کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

''دیپو، تم یہاں؟ تم یہاں کیسے آئے؟ تم اچھے ہو گئے ہو؟ تم چل سکتے ہو؟'' یہ کہتے کہتے وہ تقریباً بے ہوش سی ہو کر دیپو کے بازوؤں میں جھول گئی۔

دیپو نے ندی سے پانی لے کر جیوتی کے منہ پر چند چھینٹے مارے جس سے جیوتی ہوش میں آ گئی۔

''مجھے کسی گیانی نے چالیس راتیں ندی کے گھاٹ پر چلہ کرنے کے لئے کہا تھا جس کا تمھیں پتا نہیں چلنا چاہیے تھا۔ میں ہر رات یہاں اسی لئے آیا کرتی تھی۔'' جیوتی نے جیسے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی۔

''بس چپ ہو جاؤ، جیوتی!...... تو اس ویرانے میں چالیس راتوں سے میرے لئے آ رہی تھی اور میں تم سے اس قدر بدگمان تھا...... دھتکار ہے مجھ پر...... دھتکار ہے!''

جیوتی کے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔ دیپو نے روتی ہوئی جیوتی کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ سب مجھ سے کیوں چھپایا؟ چھنال کہیں کی!''

دیپو کی بات سن کر جیوتی شرم سے لال ہو کر بیر بہوٹی بن گئی۔

دور گھاٹ پر رات کے سناٹے میں کسی منچلے کے گانے کی آواز آ رہی تھی:

کھلے شگوفے پیڑوں پر ، رُت پیا مِلن کی آئی
من ہی من دیکھ کے اُس کو، گوری ہے شرمائی

○

کچھ غم تو اندھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا
(رضیہ اسماعیل)

مکئی کا دانہ

لُک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے......لُک چھپ جانا......

نمبردار ملک عزیز کی وسیع و عریض پختہ حویلی کی عقبی دیوار سے متصل کھیل کے میدان میں حسبِ معمول ہر روز کی طرح آج بھی بچوں کے کھیل کوداور شور وغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر آج ان آوازوں میں شوخی، شرارت، جوش اور جذبے کے رنگ قدرے پھیکے پھیکے سے تھے۔یوں لگ رہا تھا جیسے رنگین لہریئے دوپٹے کو تیز دھوپ میں کافی دیر تک سکھانے سے اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہوں۔

ادھر نمبردار کی حویلی میں آمد و رفت معمول سے کچھ زیادہ تھی۔حویلی کا بڑا پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔گاؤں کے بڑے بوڑھے، مرد، عورتیں اور بچے حویلی کے صحن اور برآمدے میں جمع ہو رہے تھے۔

سب سے بڑے کمرے کے بیچوں بیچ رکھی رنگین پائیوں والی چارپائی پر نمبردار کا اکلوتا وارث شیر خوار ننک سلطان بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

نمبردار اور نمبردارنی کے چہروں کے رنگ کسی آنے والے طوفان کے خوف

سے اُڑے ہوئے تھے۔

نمبردار کے کچھ قریبی عزیز بھی حویلی میں پہنچ چکے تھے اور ننھے ملک سلطان کی چارپائی کے اردگرد کھڑے بہت پریشانی اور اضطراب میں ہاتھ مل رہے تھے۔یوں لگتا تھا وقت ان کے ہاتھوں سے سرکتا جارہا تھا، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

نمبردار شدید ہیجانی کیفیت میں کبھی کمرے میں چکر لگاتا تو کبھی باہر برآمدے میں آکر وہاں رکھی ہوئی کرسیوں پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر کمرے کے اندر چلا جاتا اور اپنے اکلوتے وارث کی چارپائی کے اردگرد یوں چکر لگانے لگتا جیسے شہنشاہ بابر اپنے عزیز از جان بیٹے ہمایوں کی بیماری اپنے سر لینے کی دعائیں کر رہا ہو۔

''اوئے، کہاں مر گیا ہے کمپونڈر......؟ آج کیا وہ گاؤں میں نہیں ہے؟ دیکھو یہیں کہیں ساتھ والے گاؤں میں گیا ہوگا، پکڑ کے لاؤ اسے!'' نمبردار کی غصے اور پریشانی میں گندھی ہوئی رُعب دار آواز گونجی۔

''جی مالک، بندے اسے ڈھونڈنے کے لئے گئے ہیں۔بس ابھی آتے ہوں گے۔'' منشی کریم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''پتا نہیں بندے کب کمپونڈر کو لے کر آئیں، منشی تم ایسا کرو کہ گھوڑی تیار کروا کے کسی بندے کو شہر بھیجو تاکہ وہ وہاں کے بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر عباس کو ساتھ لے کر گاؤں آئے۔'' نمبردار نے منشی کو حکم سے زیادہ ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

آج نمبردار کو رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے گاؤں میں ہسپتال کیوں نہ بننے دیا؟ طفیل جولاہے کا بیٹا عباس جو اس نے بچپن میں شہر میں اپنے کسی امیر بے اولاد رشتے دار کو دے دیا تھا، اب پڑھ لکھ کر بڑا قابل ڈاکٹر بن گیا تھا۔وہ گاؤں میں ہسپتال کھولنا چاہتا تھا مگر نمبردار نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور الٹی

سلٹی دلیلیں دے کر اسے گاؤں سے چلتا کر دیا۔

نمبردارنی نے ملک عزیز کو گاؤں میں ہسپتال کھولنے کے لئے جب قائل کرنا چاہا تو ملک عزیز کا غرور و تکبر میں ڈوبا ہوا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

''اب کمی کمین ہمارے سر پر چڑھ کر بیٹھیں گے۔ یہ لوگ پاؤں کی جوتی کی نوک پر رکھے جانے کے لائق ہی ہوتے ہیں۔ انھیں زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیے۔ ڈاکٹر بن گیا ہے تو کیا ہوا، ہے تو جولاہے کا بیٹا ہی ناں۔''

ملک عزیز نے بڑی نخوت سے رنگین پیچواں حقے کی نے پرے پھینکتے ہوئے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طفیل جولاہے اور اس کے ڈاکٹر بیٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھا کر گاؤں سے باہر پھینک رہا ہو۔

نمبردار کا رویہ دیکھ کر اس لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی، زمانہ اور کائنات سب اسی کی دسترس میں ہوں اور باقی ہر شخص اس کی نظر میں مردہ، بے وقعت اور بے توقیر ہو، جس کے وجود کے اجزائے ترکیبی فضا میں تحلیل ہو کر زمان و مکان کی حدود و قیود سے باہر نکل چکے ہوں۔

آج ملک عزیز کی جان شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے طفیل جولاہے کا ڈاکٹر پتر یاد آ رہا تھا جسے کسی وقت اس نے بڑی رعونت سے کمی کمین کا بیٹا کہہ کر دھتکار دیا تھا۔

بے سدھ پڑے ہوئے ننھے ملک سلطان کی عمر رسیدہ دادی اپنے نحیف و نزار وجود کے ساتھ لاٹھی ٹیکتی ہوئی ملازموں کے سہارے چارپائی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

اس کی جلتی بجھتی آنکھوں میں حویلی کے اکلوتے وارث کی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھتے ہوئے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے آتے ہی ملازموں کو ننھے سلطان کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرنے کے

لئے کہا اور خود آہستہ آہستہ اس کا سینہ سہلانے لگی۔

''گھر میں اگر کوئی تیز خوشبو ہے تو اسے جلدی سے لے کر آؤ!''

اس نے جیسے ہی کہا، نمبردارنی جو کافی دیر سے سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی، فوراً اٹھ کر چنبیلی اور تارے میرے کی بوتلیں اٹھا کر لے آئی۔

بڑی ملکانی نے انگلیوں کے پوروں پر تھوڑا سا تیل لگا کر دم کیا اور ننھے سلطان کی ناک کے قریب لگا دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے ماتھے اور سینے پر مالش کرنے لگی۔لیکن ننھا ملک سلطان ہوش کی دنیا سے بہت دور تھا۔

بے سُدھ پڑے ہوئے ننھے ملک سلطان کو دیکھ کر بڑی ملکانی کی جہاں دیدہ آنکھوں میں مایوسی کے سایوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں حویلی کے صحن میں شور سا مچ گیا۔ ''کمپونڈر آ گیا، کمپونڈر آ گیا۔''ملی جلی آوازیں سن کر نمبردار کی جان میں جان آئی اور وہ بے قراری سے بھاگ کر صحن میں کمپونڈر کو خود لینے چلا گیا۔

''ملک صاحب ! بچہ ٹھیک ہے۔جلدی ہوش میں آ جائے گا۔'' کمپونڈر نے بچے کا تھوڑی دیر تک معائنہ کرنے کے بعد کہا، ''آپ ایسا کریں کہ بچے کو ذرا گرمی پہنچائیں تو گرمائش سے وہ ہوش میں آجائے گا۔''

نمبردار کمپونڈر کی بات ہونقوں کی طرح سن رہا تھا مگر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس نے نوکروں کو رضائی، کمبل، گرم پانی کی بوتلیں اور انگیٹھیاں لانے کا حکم دے دیا۔

کمرہ جون جولائی کی سخت گرمی میں انگیٹھیاں جلانے سے تندور بن چکا تھا۔ ہر کوئی پسینے میں شرابور کمرے سے تھوڑی دیر کے بعد ہانپتا ہوا نکل کر برآمدے میں آ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا تھا۔

لُک چھپ جانا

مکئی دادانہ

راجے دی بیٹی

آئی جے......لُک چھپ جانا......

کھیل کے میدان سے بچوں کے ''لکن میٹی'' کھیلنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

اس کھیل کے میدان کے عین وسط میں بوہڑ کا بہت پرانا درخت تھا جس کی شاخیں اس قدر گھنی تھیں کہ دن کے وقت سورج کی روشنی بھی ان میں سے گزر کر بمشکل ہی زمین تک پہنچ پاتی تھی۔ اس لئے وہاں دن کے وقت بھی ہلکا سا اندھیرا ہی رہتا تھا جو اس جگہ کو قدرے پُر اسرار سا بنائے رکھتا تھا۔

بوہڑ کے درخت کی شاخیں اس قدر پھیل چکی تھیں کہ انھوں نے تقریباً کھیل کے سارے میدان کے اوپر ایک چھتری سی تان رکھی تھی۔ کئی جگہ تو یہ شاخیں اتنی نیچی ہو چکی تھیں کہ زمین کو چوم رہی تھیں۔ بچے اکثر ان شاخوں کے ساتھ جھولا جھولتے رہتے تھے۔

یہ قطعۂ زمین بھی نمبردار کی ہی ملکیت تھا جو اس نے اپنے مال مویشی باندھنے اور ان کے راکھے کی رہائش کی غرض سے حویلی کی تعمیر کرتے وقت الگ چھوڑ دیا تھا۔ اس میدان کے ایک طرف حویلی کی اونچی دیوار تھی اور باقی دونوں اطراف میں کچی پکی کوٹھریاں تھیں جن میں سے ایک کوٹھری تو راکھے کی تھی جب کہ سامنے کی چار کوٹھریاں مویشیوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔

ان کوٹھریوں کی بیرونی دیوار قبرستان کی طرف تھی۔ کھیل کا یہ میدان بس ایک سمت سے ہی کھلا ہوا تھا۔

بوہڑ کے بوڑھے درخت نے اس قدر ہاتھ پاؤں پھیلا لیے تھے کہ اس کی گھنی شاخیں نمبردار کی حویلی کی اونچی دیوار پھاند کر اس کے صحن تک جا پہنچی تھیں جس سے اس کے ایک حصے میں اندھیرا سا ہونے لگتا تھا جو نمبردار کو سخت ناپسند تھا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ صحن پر جھکی ہوئی شاخوں کو کٹوا دیا کرتا تھا۔

آج صبح ہی نمبردار نے بوہڑ کی بہت سی شاخیں کٹوا دی تھیں۔ نمبردارنی قدرے وہمی طبیعت کی مالک تھی۔ بوہڑ کی سرسبز شاخوں کو کٹتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ ہرے بھرے درختوں کو کاٹنے سے نحوست پھیلتی ہے۔

بوہڑ کے درخت کی شاخوں کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں بھی بہت دور تک پھیل چکی تھیں۔ تقریباً کھیل کے آدھے میدان پر تو بوہڑ کی جڑوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ ایک روز یہ جڑیں بڑھتے بڑھتے ملحقہ قبرستان تک پہنچ کر قبروں میں سوئے ہوئے مُردوں کو بھی پریشان کر دیں گی اور روزِ محشر جب مُردے اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے تو اکاس بیل کی طرح ان کے بدن سے لپٹی ہوئی یہ جڑیں بھی قبروں سے باہر آ جائیں گی۔

کھیل کے میدان کی کھلی جانب کچے پکے مکانوں کی ایک قطار تھی۔ اس سے ذرا آگے ایک مسجد تھی جس کے احاطے میں بھی ایک بہت پرانا بوہڑ کا درخت تھا جس کی شاخوں نے احاطے کے علاوہ مسجد کے صحن کے بڑے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر نمبردار کے برعکس مسجد کے صحن میں پھیلی ہوئی شاخوں کو کبھی کسی نے نہیں کٹوایا تھا۔

مسجد کے بیرونی صحن کے تین اطراف ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ کہیں کہیں تو اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو جاتا تھا کہ ایک چھوٹے سے دریا کا گمان ہوتا تھا۔ تالاب کے اس پار سرسبز کھیتوں کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ تھا۔ برسات کے موسم میں تالاب کا پانی کنارے پھلانگ کر اکثر قریبی گھروں میں گھس جایا کرتا تھا مگر گاؤں والے اسے ایک

معمول کی بات سمجھ کر پریشان نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ برسات کا موسم آتے ہی گھروں کے سامنے ریت کی بوریوں کی دیوارسی بنا دیا کرتے تھے جن سے پانی کو زیادہ کُھل کھیلنے کا موقع نہ ملتا۔

تالاب کا تھوڑا سا حصہ کھیل کے میدان کے قریب تھا۔ بچے جب لُکن میٹی، گلی ڈنڈا، شٹاپو، کوکلا چھپا کی، پٹھو گرم اور گولیاں کھیلنے سے اکتا جاتے تو زیادہ تر لڑکے تالاب کے اس حصے میں اگے ہوئے کنول کے پھول توڑنے کی کوشش کرتے اور اس کوشش میں کئی مرتبہ وہ پانی میں بھی گر جاتے تھے مگر خوش قسمتی سے تالاب کے اس حصے میں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔

گرمیوں کی جھلستی ہوئی دوپہر میں اس میدان میں بچوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا کیوں کہ یہاں سورج کی شعاعیں زمین تک نہ پہنچنے کے باعث کافی خنکی رہتی تھی۔ برسات کے موسم میں بھی یہ جگہ بچوں کے دم سے آباد رہتی تھی۔ کتنے ہی زور کی بارش ہوتی لیکن صرف چند بوندیں ہی درخت کی گھنی شاخوں سے لڑ لڑا کر زمین تک پہنچ پاتی تھیں۔

گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں کبھی کبھار نمبردار کی اکلوتی بیٹی چندا اپنے شیر خوار بھائی ملک سلطان کو لے کر وہاں آجایا کرتی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ رنگین پیڑھی اٹھائے ہوئے نمبردارنی کی خاص ملازمہ چھیمو بھی ہوا کرتی تھی۔

ملک سلطان بڑی منتوں مرادوں، تعویذ گنڈوں اور دوا دارو کے بعد نمبردار کی پہلوٹی کی بیٹی چندا کے چودہ برس بعد پیدا ہوا تھا۔

نمبردار عمر رسیدہ تھا۔ کئی مربع زرعی زمین کا مالک تھا۔ جائیداد کے وارث کی شدید خواہش برسوں بعد پوری ہوئی تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ گاؤں میں کئی روز تک جشن کا سماں رہا۔ غریب غربا کو کھانا کھلانے کے علاوہ نمبرادرنی نے دل کھول کر صدقہ

خیرات کیا۔

مسجد کے مولوی صاحب نے بطور خاص ملک سلطان کی حفاظت کے لئے تعویذ لکھ کر دیا جو ہر وقت اس کے گلے میں پڑا رہتا تھا۔

نمبردارنی بہت سی ملازمائیں ہونے کے باوجود روزانہ خود ملک سلطان کے بدن کی مالش کرتی، اسے نہلاتی، بدن پر پوڈر چھڑکتی، بالوں میں خوشبودار تیل لگاتی، بڑے پیار سے بال بنا کر آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیرتی اور نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے بچے کو کالا ٹیکہ لگانا کبھی نہ بھولتی تھی۔

مولوی صاحب کا دیا ہوا تعویذ ہر وقت بچے کے گلے میں پڑا رہتا مگر نہلاتے وقت نمبردارنی تعویذ کو اتار کر، چوم کر قدرے اونچی جگہ پر رکھ دیا کرتی تھی تاکہ اللہ کے کلام کی بے ادبی نہ ہو۔

ڈیڑھ دو سال کا گول مٹول، سرخ و سپید رنگت والا ملک سلطان اس قدر خوب صورت تھا کہ ہر دیکھنے والا کا دل اس کی بلائیں لینے کو چاہتا تھا۔

چندا جب کبھی بھی چھوٹے ملک کے ساتھ کھیل کے میدان میں آتی تو نمبردارنی اس کے پاس دوسرے بچوں کے لئے کبھی کھٹی میٹھی گولیاں، کبھی ریوڑیاں، کبھی مرونڈا تو کبھی باداموں والا گڑ بھیج دیا کرتی تھی جو چندا سب بچوں میں بانٹ دیا کرتی تھی۔اس لئے بچے نمبردار کی بیٹی کا کھیل کے میدان میں بہت بے تابی سے انتظار کرتے رہتے تھے اور جس دن چندا آ جاتی، اس دن گویا ان سب کی عید ہو جایا کرتی تھی۔

آج جب چندا کھیلنے کے لئے آئی تو خلافِ معمول ملازمہ اس کے ہمراہ نہیں تھی اور نہ ہی کوئی میٹھی چیز اپنے ساتھ لائی تھی۔آج نمبردارنی نے اسے زمینوں سے آئی ہوئی تازہ مکئی شیدو ماچھن سے بھنوا کر ساتھ کر دی تھی۔

کھٹی میٹھی گولیوں، ریوڑیوں، گڑ اور مرونڈے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہوئے بچوں کو مکئی کے دانے دیکھ کر قدرے مایوسی تو ہوئی مگر وہ جلد ہی میٹھے کو بھول کر مکئی کے دانوں پر پل پڑے۔

آج نمبر دارنی ملک سلطان کو کالا ٹیکہ لگانا بھی بھول گئی تھی۔

ویسے تو بوہڑ کے درخت کی گھنی چھاؤں میں بہت سے پرندے ہر وقت چہچہاتے رہتے تھے اور کئی پرندوں نے تو کافی اونچائی پر گھونسلے بھی بنا رکھے تھے مگر آج نہ جانے کیوں پرندے کچھ خاموش سے تھے۔

الوؤں کا ایک جوڑا کہیں سے آ کر بوہڑ کی شاخوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان الوؤں کو دیکھ کر بچوں میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ شوقِ تجسس میں وہ سب الوؤں کے پیچھے پڑ گئے۔ الوؤں کا جوڑا جہاں بھی جا کر بیٹھتا، سب بچے انھیں چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر مارتے اور شی شی کر کے انھیں وہاں سے بھگا دیتے۔ یوں دونوں پریشان حال الو شاخ شاخ پر چکر لگا رہے تھے۔ لگتا تھا انھیں درخت کی گھنی شاخوں میں سے نکلنے کا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا ورنہ اتنے شور شرابے سے تو وہ ضرور وہاں سے اُڑ کر چلے جاتے۔

''نہ تنگ کرو انھیں، بیٹھے رہنے دو!'' نمبردار کی بیٹی چندا کی آواز گونجی مگر بچوں نے سنی اَن سنی کر دی۔

''ناں جی! ان کو یہاں سے اُڑا دو۔ میری اماں کہتی ہے الو منحوس ہوتے ہیں۔ یہ جس جگہ بیٹھ جائیں وہاں نحوست پھیلا دیتے ہیں۔'' ایک دوسری لڑکی نے گویا وارننگ دے ڈالی۔

نحوست اور منحوس کے الفاظ سن کر تو سارے ہی بچے الوؤں کو وہاں سے بھگانے کے مشن پر لگ گئے۔ پریشان حال الو شاخوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ ہر بچہ اوپر

منہ اٹھا کر درختوں کی گھنی شاخوں میں الوؤں کو ہی تلاش کر رہا تھا۔

اس شور شرابے سے پریشان ہو کر ملک سلطان نے بُری طرح رونا شروع کر دیا تو چندا نے اسے مکئی کے چند دانے دے کر بہلانا چاہا مگر وہ بدستور روتا رہا۔

پھر اچانک روتے روتے ملک سلطان کی سانس اکھڑنے لگی۔ اُسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی جس پر چندا نے چیخنا چلانا شروع دیا۔ سب بچے الوؤں کو چھوڑ کر چندا اور ملک سلطان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ملک سلطان کے چہرے کی رنگت لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

بچے کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کچھ بچے حویلی کی طرف بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں حویلی کے سب ملازم، نمبردار اور نمبردارنی بدحواسی کے عالم میں کھیل کے میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ حیران و پریشان نمبردار بچے کو بازوؤں میں اٹھائے حویلی میں واپس لے آیا اور چارپائی پر لٹا دیا۔

شیر خوار ملک سلطان ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ دوپہر سے سہ پہر ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ملک سلطان کے چہرے کی سرخ و سپید رنگت نیلاہٹ کے بعد اب زردی مائل ہو چکی تھی۔

شہر سے طفیل جولاہے کا پتر ڈاکٹر عباس ابھی تک گاؤں نہیں پہنچا تھا، نہ ہی کمپونڈر کا کچھ پتا تھا کہ وہ کہاں گیا؟

"اوئے کمپونڈر کو ہی ڈھونڈ کر لے آؤ، وہ حرام کا جنا اب کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

نمبردار کی غصے اور بے بسی میں بھری ہوئی آواز جیسے ہی گونجی، ملازموں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا مگر کافی تلاش کے بعد بھی کمپونڈر کا کوئی پتا نہ چلا۔

"وہ انھیں کہاں ملے گا، وہ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" کسی نے دبی

دبی آواز میں کہا۔ ''ہاں ، نہر والی سڑک پر جاتے ہوئے تو میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔'' ایک دوسری آواز نے گویا کمپونڈر کے ملک سلطان کے علاج میں ناکامی اور نمبردار کے غیظ وغضب سے بچنے کے لئے گاؤں سے بھاگنے کی تصدیق کر دی۔

حویلی کے صحن میں پھر شور سا مچ گیا۔

''شہر سے بڑا ڈاکٹر آ گیا ہے۔ آ گیا ہے ڈاکٹر۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اللہ ملک سلطان کو حیاتی دے۔

نمبردار کے وارث کی خیر ہو،

ستے خیراں ہون ملک سلطان دیاں۔''

ملی جلی آوازوں کی بھنبھناہٹ میں اپنی گاڑی سے اتر کر ڈاکٹر عباس تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔ حویلی کے صحن میں موجود سب ہی لوگ تقریباً بھاگتے ہوئے ڈاکٹر کے پیچھے کمرے میں جمع ہو گئے۔

ڈاکٹر عباس نے نہایت عجلت میں شیر خوار ملک سلطان کا ڈاکٹری معائنہ شروع کر دیا۔ اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ اسٹیتھوسکوپ لگا کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ آنکھیں الٹ پلٹ کر دیکھیں ، ناک اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹر عباس! بچے کو ذرا ہلا جلا کر تو دیکھو'' یہ کہتے ہوئے نمبردار نے جلدی سے شیر خوار ملک سلطان کو چارپائی سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

ڈاکٹر عباس نے بچے کو دونوں پاؤں سے پکڑ کر الٹا کر کے جیسے ہی اس کی کمر پر دو چار ہلکے ہلکے ٹہوکے دیئے تو مکئی کا ایک دانہ ننھے ملک سلطان کے منہ سے نکل کر زمین پر آن گرا......

وہی مکئی کا دانہ جو آج صبح چندا نے الوؤں کے شور شرابے کے ڈر سے روتے ہوئے ملک سلطان کو چپ کرانے کے لئے دیا تھا، ملک سلطان کے گلے میں پھنس گیا تھا۔

''نمبردار صاحب! مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ملک سلطان تو...... آج صبح ہی......مکئی کے دانے...... کی وجہ سے...... دم گھٹنے سے......فوت ہو گیا تھا۔''
ڈاکٹر نے رکتے رکتے کہا۔

ڈاکٹر عباس کی افسردہ آواز جیسے ہی کمرے میں گونجی، وہاں کہرام مچ گیا۔
نمبردارنی غش کھا کر گر پڑی تھی۔

بوڑھی دادی زمین پر بیٹھ کر نیم بے ہوشی کی حالت میں بین کرنے لگی۔
''ہائے سلطان تو میرا کفن چھین کر لے گیا ہے...... جانے کی باری تو میری تھی، تجھے کس بات کی جلدی تھی؟......سب برباد ہو گیا......سب ختم ہو گیا۔''
نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے ککھ کر دیا تھا۔
ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی......نہ زمانہ رہا......اور نہ ہی کائنات۔

ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام و نشان کر دیا تھا۔

○

مل جاتے ہیں غم لیکن غم خوار نہیں ملتے
بکتی ہوں جہاں خوشیاں بازار نہیں ملتے
غم گھر کی منڈیروں پر آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اس کے آثار نہیں ملتے

(رضیہ اسماعیل)

دیوارِ گریہ

مجھے بچپن سے ہی اندھیرے اور تنہائی سے بہت وحشت ہوا کرتی تھی۔ پتہ نہیں میرے تحت الشعور میں کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا عدم تحفظ کا یہ کون سا احساس تھا جس کی گرفت سے میں زندگی بھر آزاد نہ ہو سکی۔

''کیا یہ کسی گذرے ہوئے کل کی تلخ یاد تھی یا پھر آنے والے کل کا نوحہ؟''

میں اکثر سوال کرتی مگر جواب ندارد۔ شاید ابھی سوال کرنے کا وقت ہی نہیں آیا تھا اسی لیے تو وقت کی زنبیل سے کبھی کوئی جواب برآمد نہ ہوا۔

میں اماں بابا کی پہلوٹی کی اولاد تھی۔ بنانے والے نے رنگ روپ بڑی فیاضی سے دیا تھا اس لیے جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کچھ لوگ تو دبے دبے لفظوں میں آنے والے کل کے اندیشوں کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔

''بہت زیادہ رنگ روپ بھی بدنصیبی لے کر آتا ہے۔'' پڑوس کی بوا نصیبن سے میں بچپن سے ہی یہ بات سنتی آ رہی تھی۔

''شہزادیوں جیسے رنگ روپ پر کہیں قسمت فقیروں جیسی نہ نکل آئے۔'' مستقبل کے اندیشوں سے خوفزدہ ہو کر اماں جب بھی کہتیں تو میں ان کی بات نظر انداز کر کے کسی ان دیکھے شہزادے کے تصور میں آنکھیں موند لیا کرتی تھی۔

پھر ایک دن شہزادہ آ ہی گیا۔

میں گھر کے آنگن میں اُگے بڑے سے چیری بلاسم کے درخت کے ساتھ ادھ کھلی آنکھوں سے برسات کی ہلکی ہلکی پھوار میں بیٹھی جھولا جھول رہی تھی کہ میرے روپ کی کٹاری سیدھی شہزادے کے دل میں جا کر لگی۔

نہ جانے وہ کب سے دروازے کے پاس خاموش کھڑا بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں دنیا و مافیا سے بے خبر ساون کے گیت گانے میں مگن تھی۔

اس کے اچانک چھینکنے کی آواز نے میرے انہماک کو توڑ دیا تو میں ایک اجنبی شخص کو اپنے اس قدر قریب پا کر سٹپٹا سی گئی ''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے بڑی درشتگی سے اس سے سوال کیا تو وہ کچھ نروس سا ہو گیا۔

''میں...... میں...... جی میں اشعر ہوں'' اس نے گویا منمناتے ہوئے کہا۔

''کون اشعر؟ میں نے تو تمہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

میرے تفتیشی انداز میں سوال کرنے پر وہ قدرے شوخی پر اتر آیا۔

''اگر آپ نے مجھے اس سے پہلے نہیں دیکھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔''

''یہ کس قسم کا جواب ہے۔'' میں مزید چڑ گئی۔

''کس سے ملنا ہے تمہیں اور تم یوں گھر کے اندر کس خوشی میں گھسے چلے آ رہے ہو۔ دروازے کس لیے ہوتے ہیں؟ اسی لیے نا کہ انہیں کھٹکھٹا کر گھر والوں کو اپنے آنے کی اطلاع کرو۔'' میں نے ایک دم ہی اسے نشانے پر رکھ لیا اور دو نالی بندوق سے ایک ساتھ ہی کئی فائر کر دیئے۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن اگر گھر والے دروازے کھلے چھوڑ کر صحن

میں آنکھیں موند کر جھولے جھولیں گے تو کوئی بھی اندر آ سکتا ہے۔ دروازے حفاظت کے لیے ہوتے ہیں اس لیے انہیں بند رکھنا ضروری ہے۔''

اجنبی نے زبردست جواب فائر کر دیا تو میں کھسیانی سی ہو گئی۔

''شاید میں بے دھیانی میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔'' میں نے خود سے ہی وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ زیادہ بقراط بننے کی ضرور نہیں ہے۔ سیدھے سیدھے مطلب کی بات پر آؤ۔ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''میں لاہور والی آپا کا سب سے چھوٹا بیٹا اشعر ہوں۔ اس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''پہلی مرتبہ آپ کے شہر میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بڑا خوبصورت شہر ہے اور شہر والے تو......''

دروازے پر بڑے بھیا کی آواز سن کر وہ کچھ مزید کہتے کہتے رک گیا۔

بڑے عجیب ہیں یہ اشعر میاں اور اس سے زیادہ عجیب وغریب ان کے دیکھنے کا انداز ہے۔ میں بڑبڑاتی ہوئی صحن سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

یہ اشعر سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اشعر میرے تایا ابو کی بڑی بیٹی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

لیکن مجھے اِس سے پہلے اُس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ گو اس کی چرب زبانی کے قصے میں نے سن رکھے تھے۔

وہ صرف چند روز ہی ہمارے ہاں ٹھہرا۔ ان چند دنوں میں کوئی خاص بات

چیت بھی ہمارے درمیان نہ ہوئی لیکن گھر میں چلتے پھرتے مجھے یہی احساس رہتا تھا جیسے دو آنکھیں ہر وقت میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح گھومنا پھرنا مجھے بے حد برا لگ رہا تھا۔

شکر ہے جا رہا ہے میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ برآمدے میں جاتے وقت سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے ناک سکوڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اگلے ہی ہفتے وہ پھر آن دھمکا۔ اب کی بار وہ اپنی امی کے ساتھ آیا تھا۔ آپا آتے ہی ابو کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

''چچا! آپ ہما میری جھولی میں ڈال دیں میرے اشعر کے لیے۔'' آپا نے گڑگڑا کر ابو سے کچھ اس طرح التجا کی کہ ابو بھی سوچ میں پڑ گئے پھر بولے:

''لیکن ہما ابھی چھوٹی ہے۔ شادی بیاہ کی اس کی عمر نہیں ہے۔ بڑی ہو جائے تو دیکھا جائے گا اور اشعر بھی تو ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔'' ابو نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''چچا! آپ میرا دل نہ توڑیں۔ مجھے مایوس نہ کریں۔ میں بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں۔ میری جھولی میں خیرات ڈال دیں۔''

آپا نے پھر بڑے جذباتی انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' ابو نے جواب دیا ''وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔''

''ارے نہیں چچا۔ بھلا ایسے رنگ روپ والی لڑکیاں کب زیادہ دیر تک بیٹھی رہتی ہیں؟ اس سے پہلے کہ ہما پر کسی اور کی نظر پڑ جائے آپ رشتے کے لیے بس ہاں کر دیں۔

فی الحال منگنی کر دیں۔ اشعر کی تعلیم ایک دو سال میں مکمل ہونے والی ہے۔ اس کے برسر روزگار ہوتے ہی شادی کر دیں گے۔'' آپا نے اگلا چند سالہ منصوبہ اس قدر شدومد سے ابو کے گوش گذار کیا کہ ابو کو ہاں کرتے ہی بنی۔

آپا نے اگلے چند دنوں میں ہی منگنی کی رسم ادا کرنے کی رٹ لگا دی تو ابو ان کی بات ٹال نہ سکے۔

البتہ امی اس قدر جلدی رشتہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں اس لیے وہ کافی ائف نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے دبی دبی زبان میں ابو سے کہا بھی کہ اتنی لمبی منگنی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کل کلاں کو اگر کوئی بات ہو گئی تو خوامخواہ ہی بچی کے نام کے ساتھ دم چھلا لگ جائے گا۔ قصور چاہے لڑکے والوں کا ہی ہو مگر منگنی ٹوٹنے کا سارا ملبہ لڑکی پر ہی آ کر گرتا ہے۔''

امی نے ابو کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔

آپا منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ہی لاہور واپس گئیں اور جاتے جاتے اگلے مہینے دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے اپنے ہاں ہم سب کو مدعو کر گئیں۔

میں اس سارے معاملے سے لاتعلق سی بنی یوں پھر رہی تھی جیسے میرا نہیں کسی اور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

دراصل اشعر سے اچانک ملاقات کو میں ابھی ٹھیک سے اپنے اندر جذب بھی نہیں کر پائی تھی کہ آناً فاناً منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ ایک جذباتی سا تعلق جو لڑکیاں اپنے منگیتروں کے ساتھ محسوس کرتی ہیں مجھے وہ خانہ ابھی کچھ خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے شروع میں یہ سب کچھ مجھے ایک خواب سے زیادہ نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے اُسے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے دل میں اشعر کی خاموش

خاموش نگاہوں نے کھلبلی سی مچانی شروع کر دی تھی۔

اگلے مہینے طے شدہ پروگرام کے مطابق منگنی کی رسم ادا کرنے امی ابو اور بھیا خوشی خوشی لاہور چلے گئے۔

ابو کہہ رہے تھے کہ اس دن آپا کی خوشی دیدنی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ خوش اسے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی ہر آنے جانے والے کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی تھی۔ بات بات پر قہقہے پھوٹے پڑتے تھے۔

نوکر چاکر بھاگ بھاگ کر پنڈال سجا رہے تھے۔ پکوان پک رہے تھے۔ مٹھائیاں طشتریوں میں سجائی جا رہی تھی۔ مشروبات ترتیب سے رکھے جا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا مزاج بدل گیا۔ تند و تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ زندگی کا بادبان ایک خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔

کسی بات پر ہنستے ہنستے آپا کو ایسا اُچھو لگا کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ آنکھیں باہر اُبل پڑیں۔ چہرے کی رنگت نیلی پڑ گئی اور ادھ موئی سی آپا زمین پر دھڑام سے ایسی گریں کہ پھر نہ اٹھ سکیں۔

گھر بھر میں جیسے زبردست بھونچال آ گیا ہو ''ڈاکٹر کو بلاؤ...... سینے پر مالش کرو...... پانی پلاؤ...... کمر سہلاؤ...... ہسپتال لے چلو...... گاڑی نکالو...... جلدی سے فون کرو......''

سبھی گھر والے، نوکر چاکر اور منگنی کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمان ہر طرف سراسیمہ سے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

آپا کی خوشیوں کو نظر بد کھا گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر بہت دور چلی گئیں۔

منگنی کی تقریب ماتم میں بدل گئی۔

سہ پہر تک تقریب میں شرکت کے لیے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی آہ و بکا کی آوازیں سن کر مہمان پریشان ہو رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خوشیوں سے بھرے اس گھر پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟

پنڈال میں سے کرسیاں اٹھا کر سفید چادریں بچھائی جانے لگیں، ہار، پھول، سجاوٹ نوچ نوچ کر پنڈال سے اتار لیے گئے۔ ایسا پنڈال کس نے دیکھا ہوگا جہاں کچھ دیر پہلے تک زندگی قہقہے لگا رہی تھی اور اب ہر سو موت کی زردیاں پھیلی ہوئی تھیں؟

خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ چکا تھا۔ اندھیرے اور خوف کا عفریت اپنی باہیں کھولے کھڑا جیسے کہہ رہا تھا۔

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

آپا کے وعدے وعید اس کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔ اشعر کے ابو اس رشتے سے پہلے ہی ناخوش تھے اس لیے آپا کے چہلم کے بعد ہی انہوں نے مجھے منحوس قرار دے کر منگنی توڑ دی۔

آپا کی غیر موجودگی میں اشعر کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔

آپا کی اچانک موت کے صدمے سے ادھ موا اشعر پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ باپ کی ہٹ دھرمی کے آگے وہ بھی ہارے ہوئے جواری

کی طرح خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے سینے میں اتری ہوئی میرے روپ کی کٹاری نہ جانے کیسے باہر نکل آئی تھی۔

ہر سو اندھیرے پھیل رہے تھے...... تنہائیاں آباد ہو رہی تھیں...... وحشتیں رقص کناں تھی مگر ہر بات سے بے نیاز وقت کا پنچھی اپنے پنکھ پھیلائے اڑتا جا رہا تھا۔

میں اکثر سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ نام تو اماں بابا نے میرا ہما رکھا تھا...... خوش بختی کا پرندہ...... کہتے ہیں جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ راج کرتا ہے مگر لگتا تھا کہ یہ پرندہ میرے سر پر بیٹھنے کی بجائے میرے گرد اگرد چکر لگا کر بس دائیں بائیں سے ہوتا ہوا ہی کھسک گیا تھا اور جاتے جاتے اپنے طاقتور پروں سے میری تقدیر کا چراغ بھی گُل کر گیا تھا۔

''شاید دُکھ کا مجھ سے کچھ زیادہ ہی رشتہ ہے۔ ایک دن ہنستی ہوں تو دس دن رونا پڑ جاتا ہے۔'' میں نے ایک دن آنسو پونچھتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن ندا سے کہا۔

''آپا آپ دل چھوٹا نہ کریں، اللہ کی مرضی، شاید اس میں ہی کوئی بہتری ہو گی۔'' ندا نے جیسے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیا بہتری ہے؟ مجھے منحوس قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ ہر ایک کی موت کا وقت اٹل ہے۔ آپا کا اسی طرح جانا لکھا تھا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی باتوں سے لڑکیوں کے ذہنوں میں کیسی نفسیاتی گرہیں پڑ جاتی ہیں جنہیں کھولتے کھولتے ان کی ساری عمر بیت جاتی ہے۔''

میں نے تلخی سے جواب دیا تو ندا بھی خاموش ہو گئی۔

میٹرک کے امتحان کا نتیجہ کافی اچھا آیا تو میں نے کالج جانے کی ضد شروع کر دی۔ اماں بابا دونوں ہی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔

''کیا لڑکیوں کی زندگی کا مقصد صرف شادی کر کے بچے پیدا کرنا ہی ہے۔''

میں نے ایک دن اماں سے بحث کرتے ہوئے کہا۔

''آج کل کے زمانے میں لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم بہت ضروری ہے۔ نہ جانے کل زندگی کونسا سوال لے کر سامنے کھڑی ہو جائے؟ ان میں اتنی اہلیت اور خود اعتمادی تو ہونی چاہیے کہ وہ حالات کا مقابلہ کر سکیں۔''

''ضرورت سے زیادہ خود اعتماد لڑکیوں کے گھر مشکل سے ہی بستے ہیں۔''

اماں نے اپنے موقف کے حق میں نہایت بھونڈی دلیل دے کر مجھے کافی برہم کر دیا۔

''اس قسم کی دقیانوسی سوچیں ہی تو لڑکیوں کو لے ڈوبتی ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت سرے سے ہی غلط کی جاتی ہے۔ لڑکوں کو تو ہم ریس کا گھوڑا بنا کر کھلی چھٹی دے دیتے ہیں جبکہ لڑکیوں کی شخصیت کو مضبوط کرنے اور انہیں با اعتماد بنانے کی بجائے ہم بے جا روک ٹوک سے نہ صرف ان کی عزت نفس مجروح کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بے یقینی اور بے اعتمادی کی سلاخیں گاڑ دیتے ہیں جس سے حساس طبیعت اور کومل جذبوں والی لڑکیاں مزید کمزور ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

اماں خاموشی سے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں۔ شاید انہیں مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی یا پھر انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔

''اسی لیے تو لڑکیاں اپنی ذات پر انحصار کرنے کی بجائے زندگی بھر سہارے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کو اپاہج بنا کر ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی بہت شاندار تربیت کر دی ہے ہم نے۔'' میں بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔

میری اس بحث و تمحیص کا کم از کم اتنا اثر ضرور ہوا کہ اماں نے میرے کالج جانے کی مزید مخالفت نہ کی اور ابو بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔

بڑی مشکل سے ایک سال ڈیڑھ ہی گزرا ہو گا کہ ایک فارن ریٹرن کا رشتہ آ گیا۔ گھر بھر میں پھر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''کیا ہوا اگر صاحبزادے عمر میں چودہ پندرہ برس بڑے ہیں۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے مگر کینیڈا میں پکے ویزے پر ہیں۔ خاندان بہت شریف ہے۔ بس اس سے زیادہ اچھا رشتہ ہما کے لیے آنے والا نہیں جبکہ ایک منگنی پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔'' اماں اور ابا ایک روز چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ...... تعلیم ادھوری رہ گئی......

فارن ریٹرن رشتہ تھا۔ ایف اے بی اے کی کیا وقعت؟

''صاحبزادے کے بارے میں نہ کوئی تحقیق کہ فارن میں کس کس گھاٹ سے پانی پیتے رہے ہیں؟ بس خاندانی شرافت مسلم تھی۔ وہی رشتے کا معیار ٹھہری۔''

میری تیرہ بختی یہاں بھی جیت گئی۔

کینیڈا آتے ہوئے جہیز اور بری کے دونوں سوٹ کیس ٹورنٹو ایئرپورٹ پر جہاز سے برآمد ہی نہ ہوئے۔ میں رو رو کر پرائے دیس میں ہلکان ہو رہی تھی کہ کتنے چاؤ سے اماں نے کیسے کیسے ملبوسات تیار کروائے تھے۔ یہ سوچ کر کہ وہاں کپڑے سینے سلانے کی سہولت کہاں ہو گی۔

کئی دن انہی تین کپڑوں میں جو پاکستان سے پہن کر آئی تھی گذر گئے۔

زیادہ رونے پر میاں گھرکیاں دینے لگتے۔

''بند کرو یہ رونا دھونا۔ بس قسمت میں نہیں تھے اور بن جائیں گے۔''

''یہ سب کچھ میری ہی قسمت میں کیوں نہیں ہوتا؟'' میں کاتب تقدیر سے سوال کرنے لگتی۔

پرایا دیس...... نہ تہذیب و معاشرت اور زبان سے واقفیت...... نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار...... نہ سکھیاں نہ سہیلیاں...... ''یہ اماں نے کہاں کالے پانی بھیج دیا۔ کیا شادی ایسی ہوتی ہے؟'' میں رہ رہ کر خود سے سوال کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ میاں کی طبیعت، عادات و اطوار، طشت از بام ہونے لگے۔ ہاتھ چُھٹ اور منہ پھَٹ۔ پینا پلانا تو خیر روز کا ہی معمول تھا۔ شام کو نشے میں دھت جھومتے جھامتے جب گھر لوٹتے تو بلاوجہ ہی روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے اور مجھے یہ سمجھ ہی نہ آتی کہ آخر میرا قصور کیا تھا جو اس طرح کا بہیمانہ سلوک مجھ سے روا رکھا گیا؟

چھ سالوں میں اوپر تلے چار بچے ہو گئے۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر میاں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہی اپنی بجائے میری نس بندی کروا دی کیونکہ اب مزید بچوں کی اسے خواہش نہیں تھی۔

میں سارا دن اکیلی چار بچوں کے ساتھ بولائی بولائی پھرتی رہتی۔ کبھی کوئی بیمار تو کبھی کسی کو چوٹ لگ جاتی اور میاں تو جیسے بچے پیدا کر کے بھول ہی گئے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بچے میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہوں جس کی سزا میں اکیلی بھگت رہی تھی۔

وقت اور حالات نے ادھ موا کر دیا۔ زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ خودکشی مذہب اسلام میں حرام نہ ہوتی تو میں بڑی خوشی سے موت کو گلے لگا لیتی۔

بالآخر نروس بریک ڈاؤن ہو گیا، جو ہونا ہی تھا۔ آخر کب تک کوئی اس قسم کے دباؤ میں زندگی گزار سکتا ہے۔

اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں اور سوشل ورکروں کے پوچھنے پر جب پہلی

مرتبہ بات باہر نکلی کہ یہ سب گھریلو تشدد کا شاخسانہ تھا تو میاں بہت برہم ہوئے۔ سخت توہین محسوس ہوئی کیونکہ اب سب کو اس کی کرتوتوں کا علم ہو چکا تھا۔

میں راندۂ درگاہ ٹھہری۔ زندگی بھر اب مصلوب ہونا میرا مقدر تھا اس لیے اسپتال سے واپسی پر میرا استقبال میاں نے مجھے طلاق کا تحفہ دے کر کیا۔

''مرد اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہے، اس کے ترکش میں طلاق کے تیر سے زیادہ زہریلا تیر اور کوئی نہیں ہوتا جس سے وہ صرف ایک عورت کو ہی نہیں مارتا بلکہ اپنے ہی بچوں کے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کر دیتا ہے۔'' میں نے آنکھوں کے کٹوروں سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

زندگی کے راستے تنگ و تاریک ہو چکے تھے۔ اماں کے خدشات حقیقت بن چکے تھے۔ شہزادیوں جیسے روپ پر قسمت واقعی فقیروں جیسی نکل آئی تھی۔

میں کس قدر سخت جان تھی کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جیے چلی جا رہی تھی۔ نہ زندہ رہنے کی خواہش مر رہی تھی کہ چار بچوں کے لیے ہر حال میں جینا ہی تھا اور نہ ہی رنگ روپ کملا رہا تھا۔ جسے دیکھو روپ کے چقماق پر اپنا آپ رگڑ کر آگ میں پروانے کی طرح جل مرنے کے لیے تیار تھا۔

وقت گزاری کے لیے سب موجود مگر میری ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔

سر سے چادر کھینچنے والے ہاتھ بہت مگر سر پر عزت کی چادر ڈالنے والا ایک بھی ہاتھ نہیں تھا۔ گویا سب دست بریدہ تھے۔

پھر ایک روز تاریکیوں، تنہائیوں اور وحشتوں کے درمان کے لیے میں نے ارضِ مقدس کے لیے رختِ سفر باندھا جہاں مجھ جیسے بے سہاروں، بے آسراؤں، حرماں نصیبوں کی جھولیاں بھرتی ہیں۔ دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ میں بھی خالی ہاتھ واپس نہ آئی بلکہ اپنی تیرہ بختی کو اپنے دامن میں سمیٹ کر واپس لے آئی۔

رحمان کے گھر میں میری ملاقات شیطان سے ہوگئی۔

وہ کہہ رہا تھا ''میں کئی برسوں سے سعودیہ میں ملازمت کر رہا ہوں۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے جو ماں کے پاس پاکستان میں رہتی ہے۔ ماں کی بھانجی ہے۔ دو بچے بھی ہیں اس لیے طلاق نہیں دے سکتا بس ماں کی خوشی کے لیے نبھاہ کیے جا رہا ہوں۔ مگر اب میں اپنی خوشی کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھی کے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہے۔''

میں اتنے زخم کھا چکی تھی، اتنے دھوکے نبھا چکی تھی کہ اب کسی کی بھی بات پر یقین کرنے کو دل مائل نہیں ہوتا تھا مگر جب اس نے خانۂ خدا میں بارہا میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ میرے دکھ درد کا ساتھی بنے گا میری ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی ہستی کو سمیٹ لے گا۔ میری سسکتی ہوئی تنہائیوں کو مسکان میں بدل دے گا۔ میرے سدا کے خوف اور عدم تحفظ کو احساس تحفظ کی ردا اوڑھا دے گا تو یقین کرنا ہی پڑا۔

اُف کتنی باتیں، کتنے وعدے...... کتنے حرف...... کتنے لفظ...... مگر سب بے وقعت، سب بے توقیر۔

چند ماہ بعد ہی وہ وزٹ ویزہ پر کینیڈا آ گیا۔ کئی سال اس کے مستقل ویزے کے لیے امیگریشن کے ساتھ کیس لڑتی رہی۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں امیگریشن والے ویزہ دینے سے انکار کر رہے تھے۔ اس لئے اس نے مجبوراً پہلی بیوی کو کاغذی طلاق بھجوا دی۔

ہزار سچ جھوٹ بول کر مستقل قیام کا ویزہ ملا تو اس کے پر پرزے نکل آئے۔

وہی صدیوں پرانی مردوں والی کہانی دہرائی جانے لگی۔ کچھ بھی تو نیا نہیں تھا۔ نظر باز آدمی تھا۔ آتے ہی شہر میں اپنے قماش کی کئی عورتوں سے یارانہ گانٹھ لیا...... پینا پلانا...... نائٹ کلب...... گالم گلوچ...... زبان درازی...... راتوں کو دیر سے گھر آنا معمول کی بات تھی......

میرے بچے مجھ سے الگ بدظن ہو چکے تھے کہ میں نے کیسا آدمی ان کے سر پر مسلط کر دیا تھا؟ نہ ہی اس نے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نہ ہی بچوں نے اسے باپ کے طور پر قبول کیا۔ وہ بھی صحیح تھے جب اپنے سگے باپ نے مڑ کر ان کی خیر خبر نہ لی تو وہ کسی اور کا اعتبار کیوں کرتے؟

خانۂ خدا میں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کھائی ہوئی قسمیں اور وعدے وعید اس نے یوں سچ کر دکھائے کہ مجھے طلاق دے کر میرے ہی شہر میں میری رسوائیوں کا سامان کر دیا...... اس نے دوسری شادی رچا لی...... کسی اپنے جیسی آوارہ منش عورت کے ساتھ......

میں سوچ رہی تھی کہ "عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی؟"

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔ بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔

میں زندگی بھر نصیب کے کورے کاغذ کو ہاتھوں میں لے کر بیٹھی یہ سوچتی رہی

کہ کب کوئی آ کر اس پر میری قسمت کا ایک خوبصورت باب رقم کرے گا؟

آج اماں کی کہی ہوئی بات بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔

''کیسی دُکھ کی مٹی لگی ہے اس کے تن کو کہ ہر بار سکھ قریب آتے آتے بس کنی کترا کر نکل جاتا ہے۔''

اندھیرے پھیل چکے تھے۔ تاریکیاں گہری ہو چکی تھیں۔ تنہائیاں آباد تھیں۔ اُمیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وحشتیں ڈھول پیٹ رہی تھیں۔ سماعتیں ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔ زندگی یوں غم کی گرفت میں آ چکی تھی جیسے شیر کے طاقتور جبڑوں میں ڈرا سہا ہوا خوفزدہ سا غزال آخری ہچکی لینے کا منتظر ہو۔

بچپن سے میرے اندر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا خوف اب پوری طرح بیدار ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اب بھی اس سے نظریں چرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے غم نے میری ہی چوکھٹ دیکھ لی ہو۔ حوصلوں کے خستہ حال بادباں پھڑ پھڑا کر میری بربادی کا نوحہ بیان کر رہے تھے۔

''تم کس دیوارِ گریہ کی آس لگائے یوں بے حوصلہ ہوئی جا رہی ہو؟'' کہیں اندر سے آواز ابھری۔

''کوئی کسی کی دیوارِ گریہ نہیں بنتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی دیوارِ گریہ ہوتی ہے۔ سر کٹ کر ہمیشہ اپنے ہی شانوں پر گرتا ہے کسی اور کے نہیں۔ جتنے آنسو بہانے ہیں آج ہی بہا لو مگر حوصلہ مت ہارنا۔ اب یہ حوصلہ ہی تمہارا قبلہ ہے جس کے گرد اگرد تمہیں زندگی بھر طواف کرنا ہے۔''

یوں لگا جیسے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بہت پیار سے دلاسہ دیا ہو۔

میں یک لخت اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔

وقت کا پنچھی پنکھ پھیلائے ہمیشہ کی طرح محو پرواز تھا مگر آج اس نے جاتے جاتے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے میرے حوصلوں کے دریدہ بادبانوں کی بخیہ گری کر دی۔

"Courage is not the towering oak

that sees storms come and go,

it is the fragile blossom

that opens in the snow."

میں ایک بار پھر نئے عزم، نئے حوصلے، نئی ہمت کے ساتھ اٹھ کر منڈیر پر بیٹھے ہوئے غم کے پرندوں کو اڑانے لگ گئی۔

○

رُوح یوں پھاند گئی جسم کی دیواروں کو
جیسے پنچھی کوئی پنجرے سے رہا ہوتا ہے
(رضیہ اسماعیل)

چیچہ وطنی

میرے ذہن کے کورے کاغذ پر پہلی کہانی یہی کوئی چھ سات برس کی عمر میں اتری ہو گی۔

آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ میرے ذہن کے پردوں سے یوں چپکا ہوا ہے جیسے زندگی ہمیشہ سے موت کی دسترس میں ہو اور اس سے فرار کسی طور بھی ممکن نہ ہو۔

میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ''چیچہ وطنی'' کو اپنے ذہن کی تختی سے نہیں مٹا سکی اس لیے آج کاغذ کے سپرد کرنے پر مجبور ہوں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اونچے شملے والا، خوبرو، گبھرو جوان چوہدری محمد خاں جب کلف لگے سفید براق کپڑے پہنے، کارتوسوں کی پیٹی اور دو نالی بندوق کندھے پر سجائے، چرچراتے ہوئے چرمی جوتوں کے ساتھ پنڈ کی گلیوں میں سے گزرتا تھا تو کنواریاں تو ایک طرف، خصماں والیوں کے دل بھی سینے میں ایک بار ضرور زور سے دھڑک اٹھتے ہوں گے۔

آج سارا پنڈ حشرات الارض کی طرح کونوں کھدروں سے نکل نکل کر چوہدریوں کی حویلی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

حیران و پریشان انسانوں کے جم غفیر کو دیکھ کر ڈھور ڈنگر خوفزدہ سے ہو کر کھونٹوں سے رسے تڑا تڑا کر بھاگ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا اور ہر ایک کو میدان حشر میں پہنچنے کی جلدی ہو۔

''ہائے میرا اُچے شملیاں والا۔ میرا پردیسی شہزادہ، مینوں خبر نہ ہوئی...... میں لٹی گئی جے لوکو۔''

سینے پر دوہتڑ مار مار کر دردناک انداز میں بین کرتی ہوئی کیم شمیم فاطمہ جٹی جسے سب فاطو جٹی کے نام سے پکارتے تھے آج بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ فاطو جٹی کی آہ و بکا سے ہر آنکھ پرنم تھی۔

شدید ذہنی صدمے کی کیفیت میں فاطو جٹی نے اپنے لمبے گھنگریالے بالوں کی چوٹی کھول دی تھی۔ سر سے ریشمی چادر اتار کر اس نے لیرولیر کر دی تھی جس سے وہ چوہدری محمد خاں کے زخموں سے رستے ہوئے لہو کو پونچھ پونچھ کر اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملتے ہوئے بین کر رہی تھی۔

''چوہدری تیری جگہ میں ٹوٹے ہو جاندی۔ ظالماں میرا کلیجہ کڈھ لیا۔ ہائے میں اپنا قول ہار گئی...... میں اپنے چوہدری دی حفاظت نہ کر سکی۔''

فاطو جٹی کے دل پسیج دینے والے ہاڑوں نے سارے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔

نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔

نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔

نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔

گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔

ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔

آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔

چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سر زمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔

پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطو جٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

دراصل اس پرامن پنڈ میں لرزہ خیز قتل کی یہ پہلی واردات تھی اور پھر قتل بھی ایسے بندے کا جس کی جی داری اور بہادری کے چرچے کئی کئی کوس تک پھیلے ہوئے تھے۔ آج چوہدریوں کی حویلی کے وسیع و عریض صحن اور چاروں طرف بنی ہوئی راہداریوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سارے پنڈ کو جیسے غم کا گھن لگ چکا تھا۔

چوہدری محمد خان کا خون سے لت پت جوان جسم حویلی کے صحن کے درمیان، سفید نواڑی چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ زندگی کی حرارت سے محروم۔ دراز قدر چوہدری کے پاؤں چارپائی کی حدیں پھلانگ کر باہر نکل رہے تھے۔ خون سے تربتر سفید لباس میں چارپائی پر لیٹا ہوا چوہدری محمد خان اس حالت میں بھی حسن و جمال کا پیکر لگ رہا تھا۔

فاطو جٹی اور چوہدری کے انوکھے ملاپ کے قصے پنڈ کے ہر بندے کی زبان پر تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ دونوں ہی کوئی دیومالائی کردار ہوں۔ اس دھرتی پر رہنے والوں سے بہت مختلف، بہت الگ، وکھری ٹائپ کے......

چوہدری محمد خان کون تھا؟ وہ اس پنڈ میں کہاں سے آیا تھا؟ سوائے فاطو جٹی کے یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ طرح طرح کے قصے پنڈ والوں میں مشہور تھے مگر بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ چوہدری محمد خان کا ساتھ والے پنڈ کے ملکوں سے بڑا یارانہ تھا اور وہ شکار کھیلنے کے لیے ان کی زمینوں پر سال میں ایک بار ضرور آیا کرتا تھا۔

ایک سال چوہدری شکار کھیلنے آیا تو خود ہی شکار ہو گیا۔

اپنے شکار کا پیچھا کرتے کرتے، ہرن کے تعاقب میں سبکتگین کی طرح گھوڑا روڑاتے دوڑاتے وہ اپنے شکاری کتوں کے ہمراہ باقی کی شکار پارٹی سے بچھڑ کر بہت دور نکل آیا۔

جان بچانے کی تگ و دو میں بھاگتا ہوا ہرن فاطو جٹی کی زمینوں پر آ نکلا۔ اتفاق سے فاطو جٹی آج اپنی زمینوں کے دورے پر نکلی ہوئی تھی۔

شکاری کتوں کی معیت میں گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے چوہدری محمد خان بھی فاطو جٹی کی زمینوں پر کھڑی فصلوں کو روندنے لگا۔

اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ و سال بھی رک گئی......

لمحے سراسیمہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں

کھینچ لیں۔

گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار گرتے گرتے بچا۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔

چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔ فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔

نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔

وقت کی ٹہنی سے ٹوٹ کر گرنے والے دو انمول لمحے ان دونوں کی جھولی میں آن گرے جنہیں انہوں نے بڑی احتیاط سے اٹھا کر اپنے اپنے دل کے کٹوروں میں بند کر لیا۔

اندھا کیوپڈ اپنا کام کر چکا تھا۔ آنکھوں والوں کو عشق کے ایک ہی وار نے تھیا تھیا کر کے نچا دیا تھا۔

ویسے تو چوہدری اتنا شاندار مرد تھا کہ کوئی بھی حسین سے حسین عورت اس پر ہزار جان سے مرمٹتی مگر یہاں لگتا تھا کہ چڑیا کی دُکی نے حکم کے اِکے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

مردانہ ڈیل ڈول، گہری سانولی رنگت اس پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، نہ ہار

نہ سنگھار، نہ کنگھی نہ چوٹی، سر جھاڑ منہ پھاڑ۔ کھلے ہڈ پیروں کے اوپر ریشمی لاچا پہنے، لب و لہجے میں مردانہ کھنک رکھنے والی فاطو جٹی میں عورتوں والی نزاکت تو نام کو نہ تھی۔ اوپر سے مزاج کبھی تولہ تو کبھی ماشہ۔ لگتا تھا اسے بناتے وقت قدرت نے نمک اور مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کر دیا تھا۔

''مگر ایک بات ہے اس میں...... عورت ہے بڑی جی دار۔ اچھوں اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔'' پنڈ کے مرد اکثر چوپال میں بیٹھ کر فاطو جٹی کے اعتماد اور تڑاک پھڑاک انداز گفتگو پر رشک کیا کرتے تھے۔

وہ مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس قدر رعب داب سے باتیں کرتی تھی کہ آخر مرد گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔

حویلی کے برآمدے میں بڑے سے رنگین پیڑھے پر بیٹھی ریشمی لاچا ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر حقہ گڑگڑاتی ہوئی فاطو جٹی ملازموں کی فوج کو ان کی نالائقی پر اکثر لعن طعن کر رہی ہوتی تھی ایسے میں وہ کسی ظالم، جابر جاگیردار سے کم نظر نہ آتی تھی۔

پنڈ والے کبھی کبھی تو سوچتے کہ وڈے چوہدری کو اس طرح کی بیٹی قدرت نے کس گناہ کی پاداش میں دے دی تھی جو عورت سے زیادہ ایک مرد تھی۔

وہ پنڈ کے وڈے چوہدری حکم داد کی اکلوتی اولاد تھی۔ کئی مربعے زمین کی اکیلی وارث۔ چوہدری اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی اس کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات وڈے چوہدری کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ بچپن میں ہی فاطو کی ماں کے مر جانے کے بعد وڈے چوہدری نے اُسے ماں اور باپ دونوں ہی بن کر پالا تھا۔ اس قدر لاڈ پیار نے فاطو جٹی کے مزاج کو اور بھی پر لگا دیئے تھے۔

فاطو جٹی کی عمر کوئی پچیس برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ پنڈ میں اس کے جوڑ کا

کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو اس شیرنی کے مقابل آتا۔

آس پاس کی زمینداریوں سے اس کے لیے شادی کے چند ایک پیغام ضرور آئے مگر فاطو جٹی کو اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور جانا منظور نہ تھا۔ اس کی شرط تھی کہ شادی کرنے والے کو گھر داماد بن کر رہنا پڑے گا جس کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ اس کشمکش میں وڈے چوہدری کا انتقال ہو گیا تو فاطو جٹی بالکل اکیلی رہ گئی۔

آج وقت اس پر مہربان تھا۔

چوہدری محمد خان سے طوفانی ملاقات کے بعد وہ یکسر کافی بدل گئی تھی۔ لب و لہجے میں قدرے نرمی آ گئی تھی۔

کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش جسے اس نے دل کی تاریک سی کوٹھڑی میں کہیں دفن کر رکھا تھا آج زندہ ہو کر جیسے باہر آ گئی تھی۔

فاطو جٹی اور چوہدری کے دھواں دھار عشق اور دونوں کے عجیب و غریب جوڑ کو دیکھ کر پنڈ کی کنواریاں اکثر ہنسی مذاق کرتے ہوئے کہتیں:

''ہائے نی لگتا ہے جیسے جن پری پر عاشق ہو گیا ہے۔ کہاں چوہدری اور کہاں فاطو جٹی۔ بے چارہ چوہدری۔'' اتنا کہہ کر سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں مگر ان دونوں کو کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

جلد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وقت کا پہیہ بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ چوہدری اور فاطو جٹی کے ہاں اوپر تلے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہو گئے تو دونوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کی حویلی بھی خوشبوؤں سے معطر ہو گئی۔

جن نے پری کو یوں قابو میں کر لیا تھا کہ چوہدری اپنے گھر کا رستہ ہی بھول

گیا۔ اس پنڈ میں اس نے مستقل ڈیرا ڈال لیا مگر سال میں ایک آدھ مرتبہ وہ اپنے آبائی علاقے میں ضرور جایا کرتا تھا لیکن کسی نے اس کے کسی رشتہ دار کو کبھی اس پنڈ میں آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

چوہدری اس پنڈ میں پردیسی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جدی پشتی پنڈ میں رہنے والوں نے اسے کبھی دل سے قبول نہ کیا مگر فاطو جٹی کے ڈر سے کبھی کسی نے زبان نہیں کھولی تھی۔

چوہدری خود چودہ جماعتیں پاس تھا۔ باذوق آدمی تھا۔ ایسے میں پنڈ کے ڈاکٹر سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی جو اس پنڈ میں واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ادب، آرٹ، موسیقی، سیاست اور کھیل کود کے علاوہ حالات حاضرہ پر زور شور سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

دونوں ہی شکار کے شوقین تھے۔ ڈاکٹر نے بھی بڑی اعلیٰ نسل کے شکاری کُتے پال رکھے تھے۔ ہفتے عشرے میں دونوں اپنے اپنے کتوں کو لے کر شکار کے لیے نکل جاتے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ان دونوں میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی۔ دونوں ہی اس پنڈ میں مہاجر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ چوہدری کی ہجرت اختیاری تھی جو اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی جبکہ ڈاکٹر کی ہجرت غیر اختیاری اور جبری تھی جو اسے ہندوستان کے بٹوارے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اختیار کرنا پڑی تھی۔

دونوں ہی پیچھے بہت کچھ چھوڑ آئے تھے مگر اس کے بارے میں وہ کبھی کھل کر آپس میں بات نہیں کیا کرتے تھے مگر اس ہجرت نے یقیناً انہیں دوستی کے ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا تھا۔

وقت سبک خرامی سے چلنا بھول کر ایک رات، ایک ہی جست میں بہت آگے نکل گیا۔

طوفانی رات، گھپ اندھیرا...... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب خلق خدا بسرتوں میں دبکی پڑی تھی۔ ایسے میں کپڑے میں منہ چھپائے، ہاتھ میں ڈنگوری اور بہت نیچی لو کیے ہوئے لالٹین پکڑے، کوئی بہت آہستگی سے ڈاکٹر کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا مگر طوفانی ہوا کے تھپیڑوں سے ہلکی دستک کی آواز دبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اجنبی کو اب کی بار قدرے زور سے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈیوڑھی کا دروازہ کھل گیا۔ اجنبی ڈاکٹر کے ساتھ ڈیوڑھی کے اندر آ کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

ڈاکٹر بے حد فکرمند لہجے میں اجنبی سے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے جلدی سے کھونٹی سے اپنا اوورکوٹ اور مفلر اُتارا۔ ہاتھ میں ٹارچ سنبھالی اور اجنبی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ڈاکٹرنی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید کوئی بہت بیمار ہے جو اتنی طوفانی رات میں کچھ بتائے بغیر ہی ڈاکٹر گھر سے عجلت میں چلا گیا ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد دروازے کی چرچراہٹ دوبارہ سنائی دی تو پہلے سے ہی جاگتی ہوئی ڈاکٹرنی بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ آپ اتنی دیر تک کہاں تھے؟ کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے؟'' ڈاکٹرنی نے جلدی جلدی کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں'' ڈاکٹر نے نہایت آہستگی سے جواب دیا مگر پریشانی ڈاکٹر کے لہجے

سے مترشح تھی۔

''آخر بات کیا ہے؟ اتنی رات گئے باہر نکلنے کا اور کیا مقصد تھا؟'' ڈاکٹرنی کے اصرار پر ڈاکٹر کو بتانا ہی پڑا۔

''رنگڑوں کا مزارع آیا تھا، بڑی تشویش ناک بات بتا کر گیا ہے۔ اس لیے میں چوہدری محمد خان کو ملنے کے لیے اس کی زمینوں پر پنڈ سے باہر گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے رُک رُک کر کہا۔

''مگر پریشانی کیا ہے؟'' ڈاکٹرنی نے پھر پوچھا۔

''دراصل آج چوہدری اپنی زمینوں پر سو رہا ہے۔ کیونکہ پانی کی باری اس کی ہے۔ اس کا پانی اکثر چوری کر لیا جاتا ہے جس پر رنگڑوں سے چوہدری کی کئی مرتبہ گرمی سردی ہو چکی ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

''تو اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو زمین داروں کے روز روز کے قصے ہیں۔'' ڈاکٹرنی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

اب کی بار ڈاکٹر نے جواب دینے میں قدرے تاخیر کا مظاہرہ کیا تو ڈاکٹرنی پھر بول پڑی ''اس مزارع پر آپ کو اعتماد ہے؟ کہیں کچھ اور ہی چکر نہ ہو، مجھے تو یہ معاملہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ عزیز اچھا آدمی ہے۔ حق سچ کی بات کرتا ہے۔ اسی لیے تو ایسی طوفانی رات میں جان پر کھیل کر وہ چلا آیا ہے۔ دراصل آج رنگڑوں نے چوہدری محمد خان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آج وہ خود زمینوں پر سو کر پانی کی نگرانی کرے گا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ آپ چوہدری کے بہت اچھے دوست ہیں اسے جا کر خبردار کر

دیں کہ یا تو آج وہ واپس گھر آ کر سوئے یا پھر کچھ اسلحہ اپنے پاس حفاظت کے لیے رکھ لے۔"

"تو پھر چوہدری نے آپ کی بات مانی ہے؟" ڈاکٹرنی نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں...... بہت ضدی ہے وہ...... نڈر آدمی ہے۔ کہتا ہے جو گولی مجھے لگے گی وہ ابھی تک بنی ہی نہیں۔"

اُسے اپنی دونالی بندوق پر بہت بھروسہ ہے۔ کہہ رہا تھا "کس مائی کے لال میں جرأت ہے جو مجھے ہاتھ لگا جائے۔ میں اُسے نتھ نہ ڈال دوں گا۔"

ڈاکٹر کی تسلی تشفی کرا کے چوہدری نے اسے واپس تو بھیج دیا مگر اس طوفانی رات میں ڈاکٹر نے آنکھ تک نہیں جھپکی۔ دونوں میاں بیوی ساری رات جاگ کر کسی انہونی کا انتظار کرتے رہے۔

چوہدری کی کہی ہوئی باتیں ڈاکٹر کو یاد آ رہی تھیں "اوئے ڈاکٹر ان رنگڑوں کا دوا دارو نہ کیا کر، کم ذات لوگ ہیں۔ ٹھیک ہو کر تجھے ہی ڈنگ ماریں گے۔"

ڈاکٹر چوہدری کی بات سن کر ہنس کر کہتا "یار میں ڈاکٹر ہوں، بیمار کا علاج کرنا میرا فرض ہے۔"

"تو پھر کرتے رہو ان سانپوں کا علاج۔" چوہدری بے زاری سے جواب دیتا۔

"جب یہ لوگ لٹے ۔پٹے ہوئے ملک کے بٹوارے کے وقت بے سروسامانی کی حالت میں اس پنڈ میں آئے تھے تو ہم نے ان سب کی بہت مدد کی تھی لیکن جب انہیں اپنی زمینیں الاٹ ہوگئیں تو یہ ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے۔ بڑے ہی احسان فراموش لوگ ہیں۔ اب تو کھلم کھلا دشمنی پر اُتر آئے ہیں۔" چوہدری گویا آج دل کے

پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

''جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔ کیا خوبصورت بات کہی ہے حضرت علیؑ نے۔ یہ بات ان جیسے لوگوں پر ہی صادق آتی ہے۔'' چوہدری نے قدرے مایوسی سے کہا۔

طوفانی رات کے کسی پہر میں وقت کا پہیہ یک لخت سارے کا سارا ہی گھوم گیا...... انہونی ہو کر رہی۔ سورج کی روپیلی کرنیں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح رو رہی تھیں۔

رات کی تاریکی میں ڈنڈوں، لاٹھیوں، کلہاڑیوں، برچھیوں اور پستولوں سے مسلح رنگڑوں کے ایک بڑے گروہ نے زمینوں پر سوئے ہوئے چوہدری کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرنے کی تو کسی میں ہمت نہیں تھی اس لیے انہوں نے چھپ چھپا کر چوروں کی طرح چوہدری کے سر پر لاٹھیوں سے ایسا کاری وار کیا کہ اُسے سرہانے پڑی دونالی بندوق اٹھانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔

دن چڑھتے ہی اس لرزہ خیز قتل کی خبر بڑی تیزی سے دور دور تک پھیل گئی۔

پھر وہی پولیس...... آنیاں...... جانیاں...... کاغذی کارروائیاں...... تفتیش...... جائے وقوعہ...... گرفتاریاں...... آلۂ قتل...... ایف آئی آر...... ثبوت...... گواہ...... شہادتیں...... عدالتیں سب کچھ ہی موجود تھا سوائے چوہدری کے۔

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کے بعد چوہدری کی لاش واپس پنڈ میں آئی تو ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ دوپہر تک تدفین کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

اچانک یوں لگا جیسے پنڈ میں بھونچال آ گیا ہو۔ درودیوار لرزنے لگے۔ زمین کانپ کانپ گئی۔ بہت سے لوگوں کے بری طرح رونے پیٹنے اور بین کرنے کی

آوازوں نے سارے ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔

عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم سینہ کوبی کرتا ہوا حویلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک اور کربلا سجا دی گئی ہو اور حسینی قافلہ یزید کے دربار میں ماتم کرتا ہوا جا رہا ہو۔

کوفیوں کی طرح اس ماتم کناں ہجوم کا نظارہ کرنے کے لیے پنڈ والے گلیوں، بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر اُمڈ پڑے۔ سب حیران و ششدر تھے کہ یہ کون سے سگے سمبندھی ہیں جو اس انداز میں پنڈ میں وارد ہوئے ہیں۔

اس ماتمی جلوس میں سب سے آگے اونچی لمبی، لش لش کرتی، مکھنوں کی پلی، سلفے کی لاٹ ورگی، رج کے سوہنی جٹی، کالے کپڑے پہنے ہوئے بازو اٹھا اٹھا کر دہائیاں دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

یہ چوہدری کی خاندانی بیاہتا تھی جو صحیح معنوں میں چوہدری کا جوڑ تھی۔ جیسے دو سورجوں کی جوڑی ہو۔

چوہدرائن کو دیکھ کر بڑی بوڑھیوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں۔

''ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے چوہدری نے فاطو جٹی میں کیا دیکھا؟'' ایک نے حیرت سے کہا۔

''یہ سب نصیبوں کا چکر ہے۔ سنا نہیں سیانے کہہ گئے ہیں روپ رون تے کرم کھان۔'' دوسری نے جواب دیا۔

''عشق خوددار کی رسمیں بدلی نہیں جاتیں۔ عشق ظاہری شکل و شباہت نہیں بلکہ روحوں کی پہچان کا نام ہے...... بس سمجھ لو کہ چھاپ تلک سب چھینی مو سے نیناں ملائیکے'' وقت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی ہوئی جٹی نے حویلی کی دہلیز پر آ کر اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ لہولہان کلائیوں سے بال کھول کر سینے پر دوہتڑ مار کر اس حسن سوگوار نے بین کرنے شروع کر دیئے اور باقی سارے ہجوم نے بھی اس کی تقلید میں زور زور سے سر منہ پیٹنا اور رونا شروع کر دیا۔

حویلی کے صحن میں قدم رکھتے ہی آہ وفغاں کرتی ہوئی جٹی نے زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈال لی اور بری طرح روتے ہوئے آ کر صحن میں پڑے چوہدری کے بے جان وجود پر ڈھیر ہوگئی۔

کافی دیر تک وہ اسی نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی۔ پھر اچانک وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہو کر اٹھی اور پاس کھڑی ہوئی فاطو جٹی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔

''تم میری دین دار ہو فاطو۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اپنے چوہدری کو تمہارے سپرد کیا تھا۔ کون سی منحوس گھڑی میں وہ اس پنڈ میں آیا تھا۔ تو ڈائن ہے تو نے میرے سر کے سائیں کو کھالیا۔ تو نے میرے پردیسی کو مار ڈالا۔''

بڑی مشکل سے بے قابو ہوتی ہوئی چوہدرائن کو ہجوم نے فاطو جٹی سے الگ کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نئی بحث چھڑ گئی جو فاطو جٹی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔

چوہدری کی خاندانی بیوی کا اصرار تھا کہ وہ اس کی میت واپس اس کے آبائی علاقے میں لے کر جائے گی جبکہ فاطو جٹی کہہ رہی تھی کہ چوہدری کی تدفین اسی پنڈ میں ہوگی۔ دونوں عورتیں اپنے اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

کسی کروٹ بھی اونٹ نہ بیٹھتے دیکھ کر پنڈ کے نمبردار نے فوری طور پر پنچایت اکٹھی کر لی۔ پنچایت نے دونوں پارٹیوں کے دلائل بڑے تحمل سے سنے۔ سلفے کی لاٹ کہہ رہی تھی ''ساری زندگی تو نے اُسے اپنا قیدی بنا کر رکھا اب تو اُسے آزاد کر دے۔ زندگی میں تو وہ میرا نہ ہو سکا اب مٹی کی ڈھیری ہی مجھے دے دے۔ میں کم از کم اس کی قبر پر جا کر رو ہی لیا کروں گی۔''

فاطو جٹی کیا بتاتی کہ ''چوہدری کی جدائی سے تو وہ خود عمر بھر کے لیے غم کی قید میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ کسی اور کو کیا آزاد کرے گی؟''

مگر فاطو جٹی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بات کرنا ہی بھول گئی ہو یا پھر چوہدری جاتے جاتے اس کی گز بھر لمبی زبان بھی ساتھ ہی لے گیا ہو۔

بالآخر پنچایت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ''چوہدری محمد خان اس پنڈ میں پردیسی تھا مگر وہ لاوارث نہیں تھا۔ زمینوں، جاگیروں اور حسب نسب والا تھا۔ اس کی میت اس کے اصل وارثوں کو ہی ملنی چاہیے تاکہ وہ اسے اس کے آبائی علاقے میں لے جا کر دفن کر سکیں۔ یہی اس علاقے کا دستور ہے۔''

پنچایت کا فیصلہ سن کر فاطو جٹی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی عمر قید کی سزا کو پھانسی میں تبدیل کر دیا ہو۔

پنچایت کا فیصلہ سننے کے بعد ہجوم نے بڑی تیزی سے چوہدری محمد خان کی میت کو شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک پر کھڑے ٹرک کی طرف لیجانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میت ٹرک کے قریب جا رہی تھی فاطو جٹی کو یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ اُسے بھی کھینچ کھینچ کر پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہوں۔

فاطو جٹی کی دگرگوں حالت دیکھ کر میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔

''اس وقت فاطو جٹی کی دلی کیفیت کا اندازہ اس کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ اس کا قیدی تو آزاد ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے وطن واپس جا رہا ہے مگر وہ اب زندگی بھر کے لیے احساس جرم کی ٹکٹکی پر لٹکی رہے گی۔''

چوہدری یار باش آدمی تھا اس لیے اُسے الوداع کہنے کے لیے دور و نزدیک کے تعلقوں سے چوہدریوں، سرداروں، وڈیروں، ملکوں اور خانوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا تھا۔

ان سب سے پرے دور ایک کونے میں چوہدری کا جگری یار ڈاکٹر نہایت افسردگی سے کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اس کے قریب ہی کھڑی گم سم سی فاطو جٹی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں مگر کمال ضبط کے ساتھ اپنے چوہدری کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

دفعتہً ٹرک ڈرائیور کی کھردری سی آواز نے سب کی محویت کو توڑ دیا ''جلدی کریں جی۔ بارش شروع ہونے والی ہے اور پینڈا ابھی بڑا لمبا ہے۔'' صبح سے انتظار کرتے ہوئے ٹرک ڈرائیور نے بڑی بے صبری سے کہا۔

''مگر جانا کہاں ہے؟'' ٹرک ڈرائیور نے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر ایکسیلیٹر پر بڑے زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

''چیچہ وطنی، چیچہ وطنی، چیچہ وطنی۔''

اس کے ساتھ ہی لفظ ''چیچہ وطنی'' کی گونج فضا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

ٹرک کی گڑگڑاہٹ اور لوگوں کے بے پناہ شور کے درمیان میرے ذہن کے پردوں سے چپک جانے والے لفظ ''چیچہ وطنی'' کی بازگشت پھر مجھے زندگی بھر سنائی دیتی رہی۔

○

میرے وجود میں ایک شور ہے بگھولوں کا
میں اپنی ذات کے صحرا میں قید ہوں جیسے
(رضیہ اسماعیل)

کیہ جاناں میں کون؟

کیہ جاناں میں کون؟

بلھا! کیہ جاناں میں کون؟

کیہ جاناں میں کون؟

کیہ جاناں میں کون؟

پاؤں میں گھنگرو باندھے، ڈھولک کی تھاپ پر تالیوں کے بے پناہ شور میں وہ نہایت فنکارانہ انداز میں بلھا! کیہ جاناں میں کون کی سرمدی تکرار پر کبھی کتھک تو کبھی بھارت ناٹیم کے داؤ پینترے آزما آزما کر اعضا کی شاعری کر رہا تھا۔

ویسے تو وہ ایک بہت اچھا شاعر تھا مگر آج اس کی اعضا کی شاعری دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لفظوں اور جذبوں کی شاعری سے چند قدم آگے نکل گیا تھا۔

پورا ماحول سحر زدہ سا لگ رہا تھا۔ رات دانتوں تلے انگلی دبائے حیرت سے اس گہری سانولی رنگت اور متناسب نقوش والے طویل القامت رقاص کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس نے رقص کا ایک نیا انداز اپنایا۔ بڑی تیزی سے گول گول دائرے میں گھومتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھول کر آسمان کی طرف اٹھا لی جبکہ بائیں ہتھیلی زمین کی طرف ایک خاص انداز سے کر کے وہ گویا عالم سُکر میں کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے چاروں اور دائروں گھومتی ہوئی کائنات کو تسخیر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ہم سب بڑی محویت سے اسے ایک جذب کے عالم میں رقص کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ نظارہ قابل دید سے کچھ آگے ہی نکل گیا تھا اس لیے میں نے اس منظر کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کی غرض سے جیسے ہی کیمرہ سیدھا کیا اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

میں حیران تھی کہ اس نیم مدہوشی میں بھی وہ کس قدر ہوش میں تھا۔ گویا اس کی لیزر بیم سے مسلح ادھ کھلی آنکھیں اپنے اردگرد ہونے والی ہر ہر حرکت سے پوری طرح باخبر تھیں۔

رقص میں ذرا سا وقفہ کرتے ہوئے اس نے کہا:

"It is all off the record."

اور دوبارہ اسی انہماک سے اس نے دائروں میں رقص کرنا شروع کر دیا۔

اُسے یوں والہانہ انداز میں رقص کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے مولنا جلال الدین رومی کے مزار پر ان کے پیروکار درویشوں کا مشہور صوفی رقص یاد آ گیا جو مجھے کچھ عرصہ پہلے قونیہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

مولنا روم کی وفات کے بعد تقریباً تیرھویں صدی میں اس رقص کا آغاز ہوا جسے درویش محفل سماع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس رقص میں صرف دو سازوں بانسری (نے) اور دف (ڈرم) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

تقریب کے آغاز میں درویش رقص کو متعارف کرواتے ہوئے کمنٹیٹر کہہ رہا تھا:

"It is a serious dance performed in various stages. It imitates the rotation of the heavenly spheres."

بانسری کی مسحور کن لے اور دف کی ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ ہال کے ملگجے سے اندھیرے میں سٹیج سے پردہ سرکنا شروع ہوا۔ چند درویش سیاہ گاؤن پہنے اور سروں پر تاج سے مشابہہ اونٹ کے بالوں سے بنی ٹوپیاں پہنے آہستہ آہستہ سٹیج پر نمودار ہونا شروع ہوئے۔

بیک گراؤنڈ میں کمنٹیٹر کی آواز آ رہی تھی۔

''درویشوں کے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی کی مشابہت مولانا روم کے مزار کے کتبے کے علاوہ انسانی نفس کے مزار کے کتبے سے بھی ہے۔''

بات بڑی دل چسپ تھی اور فکر انگیز بھی۔ میں کچھ اور انہماک سے پرفارمنس دیکھنے میں محو ہوگئی۔

درویشوں کے ایک لائن میں کھڑے ہوتے ہی ایک شخص جسے وہ شیخ کہہ رہے تھے اپنی نشست پر نمودار ہوتا ہے۔ درویش سیاہ گاؤن اتار کر سفید فراک نما گاؤن پہن لیتے ہیں اور سب سے آگے کھڑا رقاص اپنے شیخ کی سمت نہایت عقیدت و احترام سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں پر بوسہ دیتا ہے اور جواب میں شیخ اُس کے فراک نما لباس کو بوسہ دیتا ہے۔

''یہ محفل سماع انسان کے روحانی سفر کے مختلف مراحل کی نشان دہی کرتی ہے جس میں دل، ذہن اور جسم انسانی فطرت کے تین اہم ستون مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ سفید گاؤن نفس کے لباس سے مشابہہ ہے جبکہ سیاہ گاؤن اتارنے کی حکمت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان کا حق اور سچ کی طرف روحانی طور پر دوبارہ جنم ہوا ہے۔''

قونیہ کی محفل سماع میں کمنٹیٹر کی آواز مجھے اب قدرے دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کی آواز اب

بہت قریب آ چکی تھی۔

ہال میں وہ ایک وجد کے عالم میں Gyrating کر رہا تھا۔لٹو کی طرح تیزی سے اُسے اپنے محور پر گھومتے دیکھ کر مجھے وہ کوزہ گر یاد آ گیا جو چاک پر کچی مٹی کی لوئی سے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے شاہکار تخلیق کرتا ہے مگر نہ جانے کوزہ گر نے یہ شاہکار نامکمل کیوں رہنے دیا تھا؟

محفل سماع میں کمنٹیٹر بتا رہا تھا کہ ''کائنات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو گردش میں نہ ہو۔ ہر شے کی بقا کی بنیادی شرط لگاتار گردش میں رہنا ہی ہے اور جس لمحے بھی یہ گردش رکی سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔مولانا روم کا صوفیانہ کلام پیش کرتے ہوئے اس نے مزید وضاحت کی۔

"A secret turning in us

makes the universe turn.

Head unaware of feet

and feet head

neither cares.

they keep turning."

میری توجہ ہال میں نہایت تیزی سے چک پھیریاں کھاتے ہوئے سیاہ رنگت والے دراز قد رقاص نے پھر اپنی جانب مبذول کرالی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا رقص آہستہ آہستہ احتجاج کی شکل اختیار کر رہا ہو۔ شاید وہ ہوش اور مدہوشی کے بین بین اپنے بنانے والے سے احتجاج ہی تو کر رہا تھا۔ اپنے نامکمل ہونے کا احتجاج، اپنے ادھورے پن کا احتجاج، جیسے کہہ رہا ہو:

میں منتظر ہوں کسی ہاتھ کا بنایا ہوا
کہ جس نے مجھ میں ابھی اور رنگ بھرنے ہیں

آدھے ادھورے پھیکے رنگوں سے بنی ہوئی اس کی تصویر میں دھنک کے سارے ہی رنگ موجود تھے سوائے ساتویں رنگ کے۔ لگتا تھا اس کی آفرینش میں بنانے والے نے ساتویں رنگ کی جگہ آٹھواں رنگ استعمال کر دیا تھا۔ اسی لیے تو وہ نہ مکمل مرد بن سکا اور نہ ہی عورت۔ بس دونوں کے بیچ کی کوئی آدھی ادھوری چیز۔

دیکھنے میں تو وہ مکمل مرد ہی نظر آتا تھا لیکن مرد کے خول میں جیسے ایک نسوانی روح اس کے اندر حلول کر دی گئی تھی۔ دھنک کے ساتویں رنگ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی تلاش کے پاؤں میں جیسے چھالے سے پڑ رہے تھے۔

ساتواں رنگ کائنات کی تخلیق میں کس قدر اہم ہے اس کی قدر و قیمت تو وہی جان سکتا ہے جس کے وجود میں اس رنگ کی آمیزش ہونے سے رہ گئی ہو۔ ساتواں رنگ جو انسانیت کا مرکز و محور ہے۔ جو بندے کا اپنے خالق سے ایک روحانی تعلق پیدا کرتا ہے۔ کائنات کا یہ رنگ ساتوں زمینوں اور آسمانوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ ان میں ایک Harmony اور ایک خوبصورت Rytham پیدا کرتا ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری رہتا ہے۔

میں کسی گہری سوچ میں کافی دور نکل گئی تھی۔

''اسی لیے تو دھنک کے سات رنگ، دنیا کے سات عجوبے، خانۂ خدا کے سات چکر، ہفتے کے سات دن، موسیقی کے سات سُر اور سات گناہ کبیرہ...... سب اپنے اندر کچھ معنویت رکھتے ہیں۔ گویا کائنات پر سات کے ہندسے کی حکمرانی ہے۔''

میں نے مسکرا کر سوچا۔

وہ شکایتوں کی گٹھڑی سر پر رکھے، اندر کی موسیقی کے شور سے بوکھلا کر نہ جانے

کن کیفیتوں کے حصار میں کبھی ہتھیلیوں کو خاص زاویے سے اوپر نیچے کرنے اور کبھی دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر گول گول دائروں میں بہت تیزی سے تھرکتے ہوئے بدن کی ساری محرومیوں کو کشید کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہوئے کہہ رہا ہو:

بدن دیا ہے اگر رونق بدن بھی دے
شجر ہوں میں تو مجھے سبز پیرہن بھی دے

اُدھر قونیہ کی محفل سماع میں رقص درویش اپنے عروج پر تھا۔

وسیع وعریض ہال کے عین وسط میں سبھی درویش رقص کے دوران اپنے دائیں ہاتھ کی کھلی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے جبکہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلیوں کا رُخ زمین کی جانب تھا۔

پس پردہ کمنٹیٹر کہہ رہا تھا ''آسمان کی طرف اٹھا ہوا دایاں ہاتھ آسمان سے نازل ہونے والے فیوض و برکات کو سمیٹ رہا ہے جبکہ بایاں ہاتھ ان انوار کو زمین کی طرف منتقل کرتا جا رہا ہے۔ درویشوں کے رقص کے مختلف مراحل میں سینے پر بندھے ہوئے ہاتھ اپنے خالق کی وحدانیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی فکر کر رہے ہیں۔ اس کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اس کی حمد وثنا اور بندگی کر رہے ہیں۔ جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ زمین وآسمان کی مالک بس وہ پاک ذات ہی ہے۔''

اِدھر بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟

کی مسلسل تکرار پر ورلنگ درویشز (Whirling Dervishes) کی مانند رقص کرتا ہوا وہ ساتویں رنگ کی کھوج میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

اُدھر ہال میں درویشوں کا رقص بھی اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا جہاں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روح اپنے محبوب کی جانب محو پرواز ہے۔ انوار کی بارش میں نہائے ہوئے

درویش جیسے اپنے خالق و مالک کی ذات وصفات کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

ان کے وجود اضطراری کیفیت میں کافی دیر گردش کرنے کے بعد اب آہستہ آہستہ پرسکون ہوتے جا رہے تھے جیسے ان پر ایک وصل کی کیفیت طاری ہو چکی ہو۔

ہال میں اختتامی موسیقی بجائی جا رہی تھی۔ اس مرحلے پر رقص رک چکا تھا اور شیخ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہال کے وسط میں کھڑے درویشوں کے پاس آ گیا تھا۔ سب اُسے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور پھر درویشوں کا طائفہ آہستہ آہستہ پس پردہ چلا گیا۔

ادھر دراز قامت رقاص تھرکتے تھرکتے نڈھال ہو چکا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے حالت استغراق میں وہ اپنے بنانے والے سے راز و نیاز کر رہا تھا۔ اپنے نامکمل وجود کا نوحہ پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں گردِ راہ سے کب تک ہوا کا رُخ دیکھوں

دیئے ہیں پر تو انہیں کھولنے کا فن بھی دے

تالیوں کا شور آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا۔

ڈھولک پر تھاپ پڑنی بند ہو گئی تھی۔

مگر وہ وہیں زمین پر مراقبے کی سی کیفیت میں کافی دیر تک بیٹھا رہا جیسے کسی غیر مرئی وجود سے محو گفتگو ہو۔

یہ اٹلی میں ہمارے سات روزہ ادبی سیمینار کا آخری دن تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی اور دوسرے دن اس کے علاوہ اور کئی مندوبین کو علی الصبح ہی میلان ایئرپورٹ سے واپسی کی فلائٹس پکڑنا تھیں۔ اس لیے اسے ڈسٹرب کیے بغیر ہی سب مندوبین آہستہ آہستہ ڈائننگ ہال میں سے اٹھ کر سونے کے لیے چلے گئے۔

یوں تو وہ ایک بہت اچھا لکھاری تھا مگر اس کی اصل وجۂ شہرت اس کی

تحریروں کو پھلانگ کر بہت آگے نکل گئی تھی۔

اردو ادب میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جب کسی نے اپنی جنس اور جنسیت (Sex & sexuality) کا اظہار یوں کھلے بندوں کیا ہو۔

اس نے اپنے ہم جنس پرست (Homosexual) ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ بقول اس کے ''ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے اسے گیان مل چکا تھا اور اسے سچ بولنا آ گیا تھا۔''

اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس سچائی کے اعتراف میں اس پر لعنت ملامت کے نوکیلے پتھروں کی بوچھاڑ کے سوا اسے کچھ اور ملنے والا نہیں تھا اسی لیے تو اسے کہنا پڑا۔

خود اپنی راہ نکالی ہے میں نے پتھر سے
تمام عمر گزاری ہے اپنے ڈھب کے ساتھ

اپنے ڈھب کی زندگی گزارتے ہوئے وہ امریکہ میں ہم جنس پرستوں کی تحریک (Gay movement) کا سرخیل بن چکا تھا۔

ان کے جلسے جلوسوں کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ اکثر سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس، زیورات سے لدا پھندا ایک انوکھی چھب سے دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا تھا۔ حنائی ہاتھوں کے ساتھ شرماتا لجاتا، نازو ادا دکھلاتا کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا۔ اپنے اس مخصوص گٹ اپ کا ذکر اس نے اپنا انگریزی شاعری کی کتاب میں کچھ یوں کیا ہے:

"I wear some time flashy

red garb,

lipstick,

Adorn my hair with sandoor

and jhoomer my ears, nose

and neck with gold ornaments,

my palms and feet are

painted with Henna."

میں اس کی نظم پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کیا یہ لاشعوری طور پر کسی ان دیکھی دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے سے محروم رہ جانے کا نوحہ تو نہیں تھا؟

امریکہ میں ہال آف فیم (Hall of fame) میں اس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری اُسے مل چکی تھی۔

دنیا بھر سے اُسے جنس اور جنسیت کے موضوع پر لیکچر دینے کے بلاوے آ رہے تھے۔

اس کی انگریزی شاعری کا مجموعہ ''Myrmecophile'' امریکہ کے سٹی کالجز میں گریجویشن کے کورس میں شامل کر دیا گیا تھا۔

''شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر وہ کیا محسوس کر رہا تھا؟

آزاد ہونے کی اس نے جو قیمت ادا کی تھی وہ اس کی سوچ سے کہیں بہت زیادہ تو نہیں تھی؟

کیا وہ اصل آزادی تھی بھی یا بقول ناسک۔

مجھے آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسک
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

میں یہ سب جاننے کی بے حد شائق تھی۔

پرائی زمینوں پر انعام واکرام اور اعزازات کے باوجود اس کے ہم وطن اس کا

نام سن کر یا تو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جایا کرتے تھے یا پھر ان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی جو جلد ہی ناگواری کے احساس میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

ذاتی طور پر مجھے اس کی شخصیت کافی پراسرار سی لگتی تھی۔

چند ادبی دوستوں کے توسط سے میری فون پر ہی اس سے علیک سلیک چند مرتبہ ہو چکی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ ہنستے ہوئے اسے ''باجی'' کہہ کر بلایا تو اس نے جھٹ مجھے ''بھائی جان'' کہہ کر جوابی پتھر مار دیا۔ میں اس کی بذلہ سنجی پر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں اُسے قریب سے دیکھوں۔ اس کی شخصیت کا مشاہدہ کروں۔ اس سے بہت سے سوال کروں اور بہت سے جواب مانگوں۔

میری اس خواہش کی تکمیل کچھ اس طرح ہوئی کہ ایک روز اچانک ہی اٹلی میں منعقد ہونے والے ایک سات روزہ ادبی سیمینار اور کانفرنس کا بلاوا آ گیا۔

امریکہ، جرمنی، ہالینڈ، پاکستان، سوئزرلینڈ، اٹلی اور برطانیہ سے آنے والے مندوبین کے ناموں میں اس کا نام دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔

''اس سے ملنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔'' میں نے سوچا۔

اس لیے میں اپنی بے پناہ ذاتی اور پیشہ وارانہ مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اٹلی جا پہنچی۔

ہمارا قیام میلان شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے کافی دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا۔

ایک پرشکوہ عمارت سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے بیچوں بیچ سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دراصل یہ ایک ہوسٹل تھا جو کسی امیر اٹالین زمیندار کی ملکیت تھا اور اس نے اس تنظیم کو جس کی دعوت پر ہم سیمینار میں شرکت کے لیے گئے تھے استعمال کی اجازت

دے رکھی تھی۔

ایک دن وہ کہنے لگا ''ہمیں انسانی آبادی سے اس طرح دور رکھا گیا ہے جیسے ہم اچھوت ہوں۔'' اس کی بات سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''ہمارے اچھوت ہونے میں کیا شک ہے؟ تخلیق کا وائرس تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔'' میرا جواب سن کر اس نے زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ جو شاعر اور ادیب خود ساختہ اناؤں کے چکر میں ہر وقت لڑتے بھڑتے رہتے ہیں میرے خیال میں ان کی ٹریننگ کے لیے ان سب کو سال میں کم از کم ایک مرتبہ سات دنوں کے لیے یہاں چھوڑ دینا چاہیے۔ اس ادبی یاترا سے وہ دُھل دھلا کر جب نکلیں گے تو ادب میں بہتری کے امکانات پیدا ہوں گے۔''

تمام دن ادبی مصروفیات میں گزارنے کے بعد مندوبین جب شام کو ڈائننگ ہال میں جمع ہوتے تو سارے دن کی روئیداد کے ساتھ ساتھ خوش گپیاں، ہنسی مذاق، قہقہے اور نوک جھونک بہت اچھی لگتی تھی۔

اتنے سارے ادیبوں کا ایک چھت کے نیچے جمع ہونا حقیقت نہیں بلکہ خواب لگ رہا تھا۔ سب لوگ کافی رات گئے تک ہال میں کھانا کھانے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے جیسے اگر سو گئے تو یہ سب لمحے خواب و خیال بن کر بکھر جائیں گے۔

شروع شروع میں وہ قدرے ریزرو تھا۔ ہر ایک کا گہری گہری نگاہوں سے جائزہ لیتا رہتا جیسے وہ دلوں اور ذہنوں کا ایکسرے کر رہا ہو لیکن جب اس کی شخصیت نے پر کھولنے شروع کیے تو پتہ چلا کہ وہ زبردست مجلسی آدمی تھا۔ جتنی دیر وہ ڈائننگ ہال میں بیٹھا رہتا ہر ایک کی توجہ اس کی طرف مبذول رہتی۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ بھی تھا۔ سینکڑوں لطیفے اُسے زبانی یاد تھے جو اُس کی گفتگو میں حِس مزاح کا تڑکہ لگا کر حاضرین محفل کو خوب ہنسنے ہنسانے کا موقعہ فراہم کرتے۔ اس کی حاضر جوابی پر

زبردست حس مزاح سونے پر سہاگے کا کام کرتی جس سے محفل میں ہمہ وقت پھلجڑیاں سی پھوٹتی رہتی تھیں۔

ایک دن بڑی آہستگی سے کہنے لگا ''بڑی راز کی بات ہے صرف تمہیں ہی بتا رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے کہا؟

''ہال میں جب بھی آتا ہوں ایک آدمی مجھے عجیب عجیب نظروں سے گھورتا رہتا ہے۔ مجھے تو اس سے ڈر لگنے لگ گیا ہے۔''

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''تمہیں دیکھ کر تو لوگ ڈر جاتے ہیں تم اُس سے کیوں ڈر رہے ہو؟''

'ہنی (Honey) مجھے تو اس کی بیوی پر بڑا ترس آتا ہے۔ کتنی پرکشش ہے اور یہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔''

میں نے ''نو کومنٹ'' کہہ کر بات ختم کر دی۔

ہر ادبی سیشن کے لیے وہ نہایت اہتمام سے تیار ہوتا۔ سیاہ چائنیز کٹ ہاف کوٹ کے گلے اور بازوؤں پر خوبصورت طلائی کام۔ ڈائمنڈ، یاقوت، زمرد، الماس، عقیق، فیروزے اور پکھراج کے کئی ہار گلے میں ڈالے، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں خوبصورت نگینوں والی انگوٹھیاں سجائے اور سر پر بڑا سا کاؤ بوائے اسٹائل کا ہیٹ لیے جب وہ ایک خاص انداز سے چلتا ہوا صبح ڈائننگ ہال میں داخل ہوتا تو سب خواتین کے چہروں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ سی پھیل جایا کرتی تھی جبکہ مرد حضرات (شاید شرمندگی سے) کچھ دیر کے لیے نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔

اس کی سج دھج دیکھ کر کبھی تو ہم خواتین کم مائیگی کا شکار ہونے لگتیں مگر جلد ہی ہم سر کو جھٹک دیتے کہ کیا واہیات بات ہے۔ ہم یہاں ایک ادبی سیمینار کے لیے آئے

ہیں کسی مقابلہ حسن میں شرکت کرنے نہیں کہ اگر ہمارے بناؤ سنگھار میں کچھ کمی رہ گئی تو ججز ہمارے مارکس کاٹ لیں گے اور پھر اُس سے ہمارا کیا مقابلہ؟

دن کے وقت کانفرنس اور سیمینارز میں تو بات چیت کرنے کا موقعہ کم ہی ملتا مگر وہ جب بھی مجھے ڈائننگ ہال، برآمدوں یا لان میں چہل قدمی کرتا ہوا نظر آتا تو میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوال ضرور تیار رکھتی تھی۔

ایک دن کہنے لگا ''مجھے معلوم ہے لوگ میرے Homosexual ہونے کے بارے میں بڑے Derogatory انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ اکثر دوست احباب یہ باتیں میرے گوش گذار کر کے اصرار کتے ہیں کہ میں ان لوگوں پر جوابی پتھر پھینکوں مگر میرا اصول ہے کہ اگر میں نے کوئی بات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی یا کانوں سے نہیں سنی تو میں صرف سنی سنائی باتوں پر کیسے اعتبار کرلوں۔''

اُس کی بات سن کر مجھے اس وقت اس کا قد کوہ ہمالیہ سے بھی اونچا محسوس ہوا جبکہ اسے دوسروں کے خلاف لگائی بجھائی کر کے لکھنے پر اکسانے والے بونوں سے بھی زیادہ کوتاہ قد نظر آرہے تھے۔

ان سات دنوں میں مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے لگاتار سوالوں سے کنی کترا رہا ہو۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں جب بھی اسے ہار سنگھار کئے ہوئے دیکھتی تو میری ازلی سنجیدگی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی اور مجھ میں بے پناہ شوخی عود کر آتی۔ میرے اندر سے جیسے ایک شریر سا بچہ ہمکتا ہوا آگے بڑھ بڑھ کر کبھی اس کے گلے میں پڑے رنگ برنگے ہار تو کبھی اس کی چمکتی ہوئی انگوٹھیوں سے کھیلنے کی کوشش کرتا یا پھر اس کے سر پہ سلیقے سے رکھے ہوئے بڑے سے ہیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گرانے کی کوشش کرتا۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی ہم سب آؤٹنگ کی غرض سے وینس، پیسا کا لیننگ ٹاور اور رومیو جولیٹ کی بالکونی دیکھنے جا رہے تھے۔ میں قدرے تاخیر سے کمپاؤنڈ میں پہنچی۔ سب گاڑیوں میں لوگ بیٹھ چکے تھے صرف اس کی گاڑی میں ایک سیٹ خالی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے وہاں بٹھانے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا تو وہ تڑپ کر بولا ''خدا کے واسطے یہاں اور جسے مرضی بٹھا لو مگر اُسے مت بٹھانا۔'' گاڑی میں پہلے سے بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے جب مجھے یہ بات بتائی تو میں زبردست قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکی۔

تیر نشانے پر لگا تھا۔ میرے مسلسل مشاہدے اور اس کے اندر اترتے ہوئے سوالوں کے لیزر بیم سے یقیناً وہ بوکھلا گیا تھا۔

اپنی Sexuality کی اس قدر دلیرانہ تشہیر کے باوجود مجھے وہ اندر سے کچھ خوفزدہ سا، ڈرا ڈرا کچھ سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کانچ کے ہزاروں لاکھوں رنگین ٹکڑوں سے بنے ہوئے خوبصورت شیش محل میں براجمان تھا۔ اسے اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی زبردست پتھر آ کر اس شیش محل کو چکنا چور نہ کر دے۔

اس کے عدم تحفظ کے احساس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ژاں پال سارتر کی بات یاد آ گئی کہ ''اگر تم خود سے ڈر گئے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا خوف ہوگا۔'' یقیناً خوف کے آکٹوپس نے اسے بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

ایک شام وہ ڈائننگ ہال میں اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا وائن کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ چند اور مرد مندوبین بھی شام کو ہال کے اس کونے میں بیٹھ کر وائن سے شغل کیا کرتے تھے اس وقت تمام خواتین باہر ٹیرس پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتیں اور ہال کے اندر جانے سے حتی المقدور گریز کرتیں۔

ایک دن خواتین کی روایتی گفتگو سے بور ہو کر میں ہال کے اس گوشے کی طرف نکل گئی جہاں ناؤ نوش کا دور تقریباً ختم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا

آخری پیگ ختم کرنے کی کوشش میں تھا۔

میں خاموشی سے جا کر اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کئی خاموش لمحے گزرنے کے بعد میں نے پوچھا ''ڈرنک کیا جا رہا ہے؟''

''وائن پیو گی؟'' اس نے میرے سوال کے جواب میں ایک اور سوال جڑ دیا تو میں نے بڑی دلیری سے جواب دیا ''ہاں پی لوں گی۔''

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور مجھے آزمانے کے لیے اس نے جھٹ پاس ہی پڑے گلاس میں وائن انڈیلنی شروع کر دی۔

میں وائن کا گلاس سامنے رکھ کر کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی تو وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولا ''اب پیتی کیوں نہیں ہو؟''

''پی لوں گی اتنی جلدی کیا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''یہاں نہیں باہر جا کر پیوں گی۔'' میں نے متانت سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں وائن کا گلاس اٹھا کر باہر ٹیرس پر آ گئی۔ میرے ہاتھ میں وائن کا گلاس دیکھ کر ٹیرس پر بیٹھی ہوئی سبھی خواتین کی نگاہیں ایک ساتھ سوالیہ نشان بن کر اٹھیں ''ڈونٹ وری'' میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر وائن کا گلاس قریبی گلاب کی کیاریوں میں انڈیل دیا تو سبھی خواتین نے کورس میں مل کر ماہیا گانا شروع کر دیا:

سوہے رنگ نیں شراباں دے
بھیڑیاں جدائیاں سجنا
پھکے رنگ نیں گلاباں دے

میں نے واپس ہال میں آ کر جیسے ہی خالی گلاس اس کے سامنے رکھا وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''پی لی؟''

میں خاموش رہی تو وہ پھر بول پڑا ''نہیں تم نے اُسے پھینک دیا ہے۔''

اس نے اتنے وثوق سے کہا جیسے اسے مکمل یقین تھا کہ میں نے وائن نہیں پی تھی۔

مجھے پھر خاموش کھڑے دیکھ کر تقریباً سرزنش کرنے والے انداز میں وہ بولا:

"How disrespectful it is not to respect the wine."

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر خاموشی سے ہال سے باہر نکل آئی۔

ایک ادبی سیشن خاص طور پر اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے ایک سینئر قلم کار اور ٹی وی پروڈیوسر نے اس سیشن کی صدارت کی۔ اختتامی خطبے میں اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جو لگتا تھا کہ اسے سخت ناگوار گذری تھی، ''اس قسم کے لوگوں کو ہمارے معاشرے میں مخنس کہا جاتا ہے۔''

میں جانتی تھی کہ وہ اپنی پہچان ایک مخنس کے طور پر کروائے جانے کے سخت خلاف تھا۔ بعد میں کہنے لگا ''یہ شخص جس نے یہاں مجھے مخنس کہا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ میری عزت افزائی کر رہا ہے مگر باہر میرے بارے میں اور نہ جانے کیسی کیسی باتیں لوگوں سے کرتا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچھ دل برداشتہ سا لگ رہا تھا۔

اگلے دن کے سیشن میں فیمینزم پر بات ہو رہی تھی۔ رسمی مقالات پڑھنے کی بجائے یہ ایک اوپن ڈسکشن سیشن تھا۔

سبھی مندوبین اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس کا نقطہ نظر تھا کہ ''خواتین کی لکھی ہوئی ہر تحریر نسائی تحریر نہیں کہلا سکتی کیونکہ نسائیت کا مکمل شعور اور بھرپور احساس تو بہت سی لکھنے والیوں میں بھی مفقود ہے۔ پروین شاکر صرف اس لیے اردو شاعری میں مائل سٹون (Milestone) بن گئی ہے کہ اس نے مردوں کو گالیاں دینے کی بجائے بھرپور انسانی شعور کے ساتھ بڑے دھیمے لب و لہجے میں پہلی مرتبہ عورت کے داخلی جذبات و احساسات کی بات کی ہے۔''

سبھی مندوبین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ پھر بولا ''مردوں کا نسائی شعور پر لکھنا ناممکن ہے کیونکہ ایک عورت کے اندرونی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات سے پوری طرح ایک عورت ہی صحیح معنوں میں واقف ہوسکتی ہے۔ اس کی بات سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

میں نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا ''ہم ہمیشہ ادب میں عورتوں اور مردوں کے خیالات اور جذبات واحساسات کی ہی بات کرتے ہیں کیا کسی نے کبھی سوچا ہے کہ اب ہمارے ادب میں ایک ''تھرڈ ڈائیمنشن'' بھی آچکی ہے اور ہمیں ادب میں اس کو بھی جگہ دینا ہوگی۔''

میری بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کے اندر سے بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کی دردناک صدائیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔

اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ "Myrmecophile" ایک دن ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں پڑی کافی ٹیبل پر چند اور کتابوں کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھا کر ورق گردانی شروع کردی۔ ایک نظم جس کا عنوان "Infanticide" یعنی نوزائیدہ بچے کا قتل تھا۔ اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی بات کرتے ہوئے اس نے ایک فکر انگیز بات کہی:

"To be gay is like being

born as a female off spring

...... cant tell the sufferings

I am going through

as a homosexual."

''ہمیشہ خوش نظر آنے والا خوشیا اندر سے کس قدر ناخوش تھا؟'' میں نے دکھ سے سوچا۔ اس وقت وہ مجھے ایک Gay سے کہیں زیادہ Grief کی مورت نظر آ رہا تھا۔

اس سے اگلی نظم کا عنوان اور بھی تڑپا دینے والا تھا۔

"An orphan whose father is alive."

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا ایک بچے کے لیے بڑی بدنصیبی کی بات ہے مگر اس بچے کی بدبختی کا کیا کہنا جو باپ کی زندگی میں ہی اپنے آپ کو یتیم سمجھے۔

بُلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کی بازگشت ایک بار پھر فضا میں گونج اٹھی تھی۔

میرے خیال میں اس کی بات ایک زبردست نفسیاتی صدمے Psychological Trauma کی نشاندہی کر رہی تھی۔ وہ ہجوم میں بھی کس قدر اداس اور تنہا تنہا سا دکھائی دیتا تھا۔ اپنے بارے میں اس نے کتنا سچ کہا تھا۔

عمر کٹی ہے کسی آبدوز کشتی میں
سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

اتنے سوانگ رچانے کے باوجود وہ کس قدر تنہا اور اداس تھا۔ ایک ایسا چھوٹا سا بچہ جو باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے، اس کی ٹانگوں سے لپٹنے اور اس کے کندھوں پر بیٹھ کر زمانے کے سرد و گرم سے ناچشیدہ نگاہوں سے دنیا کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

میں کافی دیر تک کتاب ہاتھ میں پکڑے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا:

"It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا

''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟''

میں نے گویا جرح شروع کر دی۔ اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہو سکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔'' میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!'' میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟''

اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔ لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی تلخ ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔

رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔ جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

''خداحافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا...... شاید اچھا ہی ہوا...... رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟'' میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے......

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔

○

یہ آئینوں کے مقدر میں کیسی رات آئی؟
کہ اب تو عکس بھی ان میں نظر نہیں آتا

(رضیہ اسماعیل)

باکا

اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ہارمونیم کی آوز سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے ضرور رُک جایا کرتا تھا۔

کبھی کبھار تو میں اس کے کمرے کی ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکی کے پاس جا کر دبیز پردوں میں سے گھور گھور کر کمرے میں کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش بھی کیا کرتا تھا حالانکہ یہ کوشش ایسی ہی تھی جیسے کوئی موم کے پر لگا کر سورج کے قریب جانے کی کوشش کرے۔

اتنا بڑا خطرہ مول لیتے وقت میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس کی شخصیت اتنی خوفناک قسم کی کیوں تھی؟

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ کئی مہینے قبل دیکھا تھا تو وہ مجھے اس وقت ہی بہت پراسرار سا لگا تھا۔

اس کی شخصیت سے بڑھ کر مجھے اس کا اوٹ پٹانگ قسم کا نام بہت الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔

''بھلا باکا بھی کوئی نام ہے؟''

میں نے تمسخرانہ انداز میں گویا اس کی ذات کی نفی کرنا چاہی تو پاپا نے مجھے

انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

عجیب اتفاق تھا کہ میں جب کبھی بھی اس کے نام کے بارے میں استفسار کرتا تو وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہوتا تھا اس لیے پاپا اس کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے احتراز کرتے۔

میں کافی دیر سے اینکسی کے برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر کبھی بیٹھے اور کبھی تقریباً لیٹے ہوئے پاپا کی توجہ کا منتظر تھا۔ لیکن پاپا اس قدر انہماک سے کچھ لکھ رہے تھے کہ انھیں گردوپیش کی جیسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

اتنی دیر تک خاموش بیٹھے رہنا مجھے سخت ناگوار گزر رہا تھا اور ویسے بھی زیادہ دیر تک خاموش رہنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے بوریت سے تنگ آ کر دھوپ میں کافی دیر سے اٹین شین کھڑے ہوئے اس شخص کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

''گو وقت کے فریم دھندلا چکے ہیں مگر وہ جوانی میں یقیناً ہینڈسم رہا ہوگا۔''

میں نے اس کے سراپا کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

درمیانے سے قدرے نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن جیسے بہت زیادہ کسرت کرتا رہا ہو کیونکہ اس کے جسم پر کہیں ایک انچ بھی زائد گوشت نہیں تھا۔

متوازن نقوش اور کافی حد تک صاف رنگت جو چہرے کی شادابی کے رخصت ہو جانے کے بعد اب کچھ مٹیالی مٹیالی سی ہو چکی تھی۔ بیضوی چہرے پہ ستواں ناک اور پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، بڑھی ہوئی داڑھی جیسے کئی ہفتوں سے تراشی نہ گئی ہو۔

سر پر کسی زمانے میں گہرے گھنے بال رہے ہوں گے مگر اب کافی حد تک چھدرے ہو چکے تھے بلکہ ان میں جگہ جگہ کپاس پھوٹ رہی تھی۔ کنپٹیاں کافی سفید ہو چکی تھیں۔ عمر یہی کوئی پچاس پچپن کے قریب ہو گی مگر زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔

میرے نزدیک اس کی شخصیت کو مزید گھمبیر بنانے والی چیز اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں۔ جنہیں وہ کبھی کھولتا تو کبھی میچ لیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے مٹھی بھر ریت اٹھا کر اس کی آنکھوں میں پھینک دی ہو۔ جس کی چبھن کے ساتھ ساتھ سورج کی تیز روشنی اس کے لیے خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہو۔

اس تمام عرصے میں اس نے میری طرف بالکل کوئی توجہ نہ دی جیسے میں اس کے نزدیک کوئی بے حد حقیر قسم کی چیز تھی جو کسی طور بھی دیکھنے کے لائق نہیں تھی۔

لیکن اس وقت بات میرے کسی کمپلیکس کی نہیں تھی بلکہ اس کی پراسرار شخصیت کی تھی جو بڑی دل جمعی سے تیز دھوپ میں کافی دیر سے فوجی انداز میں سلیوٹ مارنے والی پوزیشن میں بے حس و حرکت کھڑا جیسے اپنے کمانڈر کا کوئی حکم بجا لا رہا ہو۔

ذرا اور غور سے دیکھنے پر لگتا تھا کہ وہ جیسے وقفے وقفے سے زیرلب مسکرا رہا تھا۔ میں نے جب اس بار اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی خوبصورت انسانی جذبے کا اظہار بھی کر سکتا تھا کیونکہ اتنے سارے مہینوں میں مجھے وہ انسان سے زیادہ ایک روبوٹ معلوم ہوتا تھا جو نہایت میکانکی انداز میں لگے بندھے طریقے سے ناک کی سیدھ میں چلتا رہتا ہے۔

اس کی پوری شخصیت پر ایک تکلیف دہ قسم کی پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی جیسے پت جھڑ کا موسم وہاں آ کر آگے جانا بھول گیا ہو۔

نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ من ہی من میں کسی سے ہمکلام تھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے کبھی اثبات تو کبھی نفی میں جواب دے رہا تھا۔

اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے بظاہر باہر کی طرف آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود اس نے اپنی اصل آنکھیں اندر کی طرف کھول رکھی تھیں بہت کچھ

دیکھ لینے کے بعد جیسے سیراب ہو کر آنکھیں اندر کی طرف برسنا شروع کر دیں اور اندر کا وجود طغیانیوں کی زد میں آ جائے۔

بظاہر لاتعلق اور پرسکون سا دکھائی دینے والا یہ شخص اس سمندر کی مانند لگ رہا تھا جس کی عمیق تہہ میں بے شمار آبی بلائیں ہمہ وقت حرکت میں رہتی ہیں لیکن جب کبھی وہ سطح سمندر پر نمودار ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو پرسکون سمندر شوریدگی کی انتہائی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔

جب سے وہ ہمارے ہاں آیا تھا اکثر خاموش ہی رہتا تھا مگر ایک مرتبہ وہ خاصی شوریدگی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

اس وقت اس کی بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں جن سے وحشت کچھ اس طرح ٹپک رہی تھی جیسے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھیل کر دو انڈوں کی شکل اختیار کر چکے ہوں جن مین سے کچھ ہی دیر میں دو وحشی چوزے باہر نکل کر دیکھنے والوں کی آنکھیں اُچک لیں گے۔

جب سے اس پر ایسی شوریدگی طاری ہوئی تھی پاپا نے مجھے اور چھوٹی بہن کوئل کو سختی سے بنگلے کے پچھواڑے میں بنی ہوئی اینکسی کی طرف جہاں وہ رہتا تھا اکیلے جانے سے منع کر دیا تھا۔

ہر روز چند گھنٹے اینکسی کے صحن میں تپتی ہوئی دھوپ میں بے حس و حرکت کھڑے رہنا اس کا معمول تھا جو میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ اس تمام عرصے میں پاپا برآمدے میں بیٹھ کر کچھ لکھنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔

میرے لیے اس کو قریب سے دیکھنے کا یہ بہترین موقع ہوا کرتا تھا اس لیے میں اکثر کسی نہ کسی بہانے پاپا کے پاس جانے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر پاپا مجھے جلد ہی

وہاں سے بھگا دیا کرتے تھے۔

آج خلاف معمول کافی دیر کے بعد پاپا نے لکھنا بند کر کے سر اٹھا کر مجھے اور اس کو باری باری دیکھتے ہوئے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ ''تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو'' پاپا کی بات سن کر میں پوری جان سے سلگ اٹھا۔ ''واہ ایک تو جنگی قیدی کی طرح مجھے یہاں کب سے بٹھا رکھا ہے اور اب اوپر سے پوچھ رہے ہیں کہ میں ابھی تک یہیں ہوں؟''

پاپا کی بات کا جواب دیئے بغیر ہی میں وہاں سے اٹھ گیا۔

جب سے وہ یہاں آیا تھا وہی پاپا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جس سے مجھے بے حد جلن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس نے کچھ ہی عرصے میں میری نظروں میں ناپسندیدہ شخصیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

اس کی یوں اچانک گھر میں آمد سے ممّی ہم دونوں بہن بھائیوں کی طرف سے خاصی فکر مند رہا کرتی تھیں۔ اور ہمیں اینکسی کی طرف نہ جانے کی بار بار یاد دہانی کرانے کے باوجود ہم دونوں پر نظر رکھتیں اور ساتھ ہی فضل بابا کو سختی سے ہدایت کرتی رہتیں کہ بچے اینکسی کی طرف نہ جانے پائیں مگر اتنی پابندیوں کے باوجود میں آنکھ بچا کر اس کی راجدھانی کی طرف نکل ہی جایا کرتا تھا۔

ممّی اور پاپا ہمارے سامنے اس کے ماضی کے بارے میں بالکل کوئی بات نہیں کیا کرتے تھے لیکن میری پندرہ سولہ برس کی متجسس طبیعت کتاب زیست کے سارے ورق ایک ساتھ ہی پلٹ دینے کی متمنی تھی۔

پاپا جب بھی اچھے موڈ میں ہوتے تو ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے وگرنہ دوسروں کی بے وقت مداخلت انھیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن جب سے وہ یہاں آیا

تھا پاپا کافی موڈی سے ہو گئے تھے۔لگتا تھا جب وہ بظاہر بالکل فارغ بیٹھے ہوتے تو اس وقت بھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہے ہوتے تھے۔اس لیے میرے دل میں اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہر اگنے والے سورج کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔

ایک دن پاپا کو بہت اچھے موڈ میں دیکھ کر میں اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ پاپا جانتے تھے کہ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے کس قدر بے تاب رہتا ہوں۔

دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر بولے ''یونس سے میری ملاقات کلکتہ یونیورسٹی میں ہوئی تھی جہاں ہم دونوں نے اکٹھے میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یونس بے حد ذہین تھا۔ ہنس مکھ اور نہایت مجلسی طبیعت رکھتا تھا۔خوش ذوق تھا۔ خوش خوراک اور خوش لباس تھا اسے فنونِ لطیفہ سے بہت رغبت تھی۔ بہت اعلیٰ شعری ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ ہارمونیم کافی مہارت سے بجاتا تھا۔ آواز میں سوز تھا۔ ہم سب دوست اکثر اس سے گانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ جسے وہ بہت خوشی سے پورا کیا کرتا تھا۔

چائے کا بے حد رسیا تھا۔اس کی چائے خاص طور پر سیلون کے باغات سے سپیشل آرڈر پر آیا کرتی تھی۔ جسے دیکھ کر ہم سب دوست اس کی نفیس طبیعت کے ساتھ ساتھ اس کی خوش قسمتی پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ اس کا والد کلکتہ کا ایک نہایت خوشحال بزنس مین تھا۔

پاپا کچھ دیر سانس لینے کو رکے اور پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولے ''وہ بھی کیا دن تھے۔ نفیس طبع اور بذلہ سنج یونس ہر محفل کی جان ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا

کہ کالج کی بہترین لڑکیوں کی چاہت کو بھی ادائے بے نیازی سے ٹال دیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سیر و سیاحت کا بے حد شوقین تھا۔ سیلانی طبیعت تھی، ایک جگہ ٹِک کر بیٹھنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوقین تھا اسی لیے فرنچ، جرمن اور ڈچ کے علاوہ اس نے تھائی، ملائی اور جاپانی زبانیں بھی سیکھ رکھی تھیں۔

دنیا کے کئی ملکوں کی سیاحت کر چکا تھا مگر ابھی تک اسے فار ایسٹ جانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔

"Far East always fasereted him."

اس کے شوقِ آوارگی کے سبب ہم سب دوست اسے مذاق میں ابنِ بطوطہ کہا کرتے تھے۔

اپنے کالج کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے پاپا کافی اداس ہو گئے تھے لیکن مجھے اس کے بارے میں جاننے کی بہت جلدی تھی اس لیے جیسے ہی پاپا ذرا خاموش ہوتے تو میں پریشان سا ہو جاتا کہ پتہ نہیں اب اس کے بعد کب پاپا اتنے اچھے موڈ میں ہوں گے؟

اس کی پراسرار شخصیت پر سے ایک ایک کر کے پردے اٹھ رہے تھے اور میں اس کی حیرت کدے جیسی شخصیت سے بے حد مرعوب ہو رہا تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اب اس سے دلی ہمدردی ہو رہی تھی اور چند ماہ سے میں نے اسے جو نہایت ناپسندیدہ شخصیت کا ٹائٹل دے رکھا تھا وہ میں نے چپکے سے واپس لے لیا تھا۔

پاپا بتا رہے تھے کہ "یونس کو سرجری میں بہت دل چسپی تھی اس لیے وہ سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ میں رائل کالج آف سرجنز (ایڈنبرا) میں چلا گیا جبکہ میں نے سائیکاٹری کی پروفیشنل ٹریننگ ہندوستان میں رہ کر ہی مکمل کی اور کلکتہ میں ہی

ملازمت اختیار کر لی حالانکہ میری ساری فیملی پنجاب میں تھی۔ شاید یہ یونس کی دوستی کا اعجاز تھا کہ میں کلکتہ کا ہی ہو کر رہ گیا۔

پاپا بہت دھیرے دھیرے یادوں کی کتاب کے ورق الٹ رہے تھے۔

''کیا اس عرصے میں آپ دونوں میں رابطہ رہا؟''

میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں'' باقاعدہ خط و کتابت ہوتی رہتی تھی پھر یونس اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس کلکتہ آ گیا تھا۔

کیا ان کی شادی ہوئی؟ میرے پوچھنے پر پاپا بتانے لگے۔

''والدین کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شادی پر رضامند نہ ہوا لیکن اس نے وعدہ کر لیا کہ جیسے ہی وہ فار ایسٹ میں چین، جاپان، ملائیشیا، فلپائن اور تھائی لینڈ کی سیاحت مکمل کر لے گا اس کے بعد ضرور سٹیل ہو جائے گا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

''ہونا کیا تھا'' پاپا نے مایوسی سے جواب دیا۔

انسان اپنے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے لیکن قدرت اس کے لیے کسی اور ہی منصوبے کی پیش بندی کر رہی ہوتی ہے۔

پاپا نے گلا صاف کرتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''دراصل ہم جس پل میں زندہ ہیں وہی پل ہمارا ہوتا ہے جو گزر گیا وہ ماضی میں گم ہو گیا اور جو کل آنے والا ہے وہ کس نے دیکھا ہے؟ بس وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کروٹ بدل لے اور زندگی کب کون سا موڑ مڑ جائے اور ہم وہیں حیران پریشان کھڑے لکیریں پیٹتے رہ جائیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یونس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔'' پاپا نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ''یہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز کا زمانہ تھا جب 1939ء میں جرمنی نے پولینڈ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا لیکن جنگ کا دائرہ ابھی یورپ سے باہر کے ملکوں تک نہیں پھیلا تھا۔ منع کرنے کے باوجود اور عالمی منظرنامے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یونس جون 1941ء میں فارایسٹ کی سیاحت کے لیے نکل گیا۔''

پاپا جیسے ہی خاموش ہوئے ممّی کی اچانک آمد نے ہمیں وقت کے گزرنے کا احساس دلایا۔ ''رات کافی بیت چکی ہے اور آپ ابھی تک باتوں میں ہی لگے ہوئے ہیں۔'' وہ قدرے خفگی سے بولیں۔

''ممّی پلیز پاپا سے بس تھوڑی سی بات اور کرنی ہے پھر میں سونے کے لیے چلا جاؤں گا۔'' میں نے ممّی کی طرف بڑی پرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کافی دنوں کے بعد باپ بیٹے میں راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ بس تھوڑی دیر اور بات ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔''

ممّی نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے پاپا کا شانہ ہلاتے ہوئے میں نے بے صبری سے کہا ''پاپا! جلدی بتائیں ناں۔ پھر کیا ہوا؟''

''جرمنی کے رویے سے پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ چکی تھی۔ کئی طرح کے اندیشے ملکوں ملکوں سر اٹھا رہے تھے۔

تمہارے دادا کا جکارتہ میں قیمتی پتھروں کا کاروبار تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ وہاں کاروبار کو سمیٹ کر سارا سرمایہ ہندوستان منتقل کر دیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے

صلاح مشورے کے لیے جکارتہ آنے کو کہا۔

میرے اور یونس کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ہم چند ماہ بعد جکارتہ میں ملیں گے اور پھر دونوں اکٹھے ہی ہندوستان واپس آ جائیں گے مگر سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

''کیوں؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بدقسمتی سے دسمبر 1941ء میں جاپان نے پیسفک میں ویسٹرن کالونیز (Western colonies) پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے یورپ کے ساتھ ساتھ ساؤتھ ایسٹ ایشیا بھی ورلڈ وار کا تھیٹر بن گیا۔ اس طرح انڈیا، برما، تھائی لینڈ، ملایا، سنگاپور، ہانگ کانگ، سب ہی جنگ کی لپیٹ میں آ گئے اور ہم سب کئی برس تک وہیں پھنس کر رہ گئے۔

پاپا پر نیند کا غلبہ طاری ہو رہا تھا ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سن کر ممّی نے مجھے بھی سونے کے لیے بھیج دیا مگر میرا ذہن نیند کی وادیوں میں اترنے کی بجائے عالمی منظرنامے میں کھویا ہوا تھا۔

میری وارفتگی کو دیکھتے ہوئے تاریخ نے اپنی کتاب کھول لی۔

جاپان کے اچانک حملے نے ویسٹر کالونیز میں تھرتھلی مچا دی تھی۔ یہ ڈچ ایسٹ انڈیز جسے آج کل انڈونیشیا کہا جاتا ہے کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔ اس ملک کا انتظام وانصرام جاپان کے حملے سے قبل نیدرلینڈ (ڈچ) کے ہاتھ میں تھا۔ جاپانیوں کے سامنے ڈچ اقتدار زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا مگر کہیں کہیں مزاحمت جاری تھی۔

مقامی لوگ جو ڈچ حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے کافی دل برداشتہ تھے۔ انہوں نے جاپانیوں کو اس اُمید پر خوش آمدید کہا کہ شاید یہ دوسروں سے بہتر حکمران

ثابت ہوں مگر یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جاپانیوں نے مقامی لوگوں پر غلامی کا شکنجہ مزید کس دیا تھا۔

ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی غیر محفوظ گویا قیامت صغریٰ برپا ہو چکی تھی۔

کہیں جاپانی مقامی لوگوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے تو وہ علاقے جن پر ابھی ڈچ تسلط تھا وہاں پر ڈچ مقامی لوگوں کو جاپانیوں کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں زیر عتاب لے آتے تھے۔

میں تاریخ کی سرگوشیاں بڑے انہماک سے سن رہا تھا کہ دفعتاً تاریخ خاموش ہو گئی۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد تاریخ نے کتاب زیست کا ایک اور ورق پلٹا۔

''اقتدار اور اختیار دو ایسی انسانی جبلتیں ہیں جن کے لیے انسان آخری حد تک پار کرنے سے گریز نہیں کرتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تاریخ سے سوال کر دیا۔

''ادھر جرمنی میں ہٹلر کے جنگی جنون سے مغرب کا ناک میں دم آ چکا تھا کیونکہ ہٹلر سارے یورپ پر کنٹرول حاصل کرنے کا خواہشمند تھا جبکہ جاپان تمام ایشیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کا متمنی تھا۔ ناعاقبت اندیش لیڈروں نے امن عالم کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا جس نے دوسری جنگ عظیم کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔''

مگر کون کس کے خلاف لڑ رہا تھا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تاریخ سے وضاحت چاہی۔

’’جاپان، اٹلی اور جرمنی ایک طرف تھے ۔جنہیں (Axis Powers) کا نام دیا گیا جبکہ انگلینڈ، فرانس، آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، روس، چین، انڈیا اور امریکہ اس جنگ میں اتحادی (Allies) تھے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم کے برعکس جو صرف یورپ میں ہی لڑی گئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم یورپ سے باہر روس، نارتھ افریقہ اور ایشیا تک پھیل گئی۔‘‘ تاریخ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

’’کوئی ملک غیر جانبدار بھی رہا یا سب ہی جنگ میں کود پڑے تھے؟‘‘ میں نے پھر سوال کیا۔

’’کچھ ممالک غیر جانبدار تھے جن میں سپین، سوئٹزرلینڈ، سویڈن اور آئرلینڈ شامل تھے۔‘‘ تاریخ نے آہستگی سے جواب دیا۔

’’اس جنگ کا ہولناک انجام جاپان کے دوگنجان آباد شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اتحادی امریکی کی طرف سے ایٹم بم گرائے جانے پر ہوا۔‘‘

اب کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر تاریخ کی دبی دبی سسکیاں فضا میں اُبھرنے لگیں۔

ایک طویل وقفے کے بعد تاریخ نے لب کھولے اور اشکبار آنکھوں سے کہا۔’’میں 6 اگست 1945ء کو کیسے بھول سکتی ہوں کیونکہ یہ انسانی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔‘‘

’’’اس دن کیا ہوا تھا؟‘‘ میں نے جیسے ہی پوچھا تاریخ بے حوصلہ ہوگئی۔

اس دن نام نہاد ترقی یافتہ انسانی تہذیب نے اپنے ہی ہاتھوں سے خودکشی کی تھی۔‘‘ تاریخ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ نہ سمجھے ہوئے نظریں اٹھا کر دیکھا تو تاریخ پھر بول پڑی۔’’اس

دن سوا آٹھ بجے امریکہ نے ہیروشیما پر چار ٹن وزنی بم گرایا تھا پھر 9 اگست کو دن کے گیارہ بج کر دو منٹ پر جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر بم گرا کر تین لاکھ سے زائد بے گناہ انسان کو چشم زدن میں زندہ درگور کر دیا۔''

اب کے جیسے سکوتِ مرگ طاری ہو چکا تھا۔

مؤرخ نے لرزتے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب زیست بند کر دی۔ انسانیت کے لرزہ خیز قتل پر نوحہ خوانی کرتی ہوئی تاریخ خاموشی سے وقت کی خزاؤں میں خیمہ زن ہو گئی۔

رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے دوسری صبح ہم سب ہی کافی دیر تک سوتے رہے۔ لیکن اچانک کسی کے چیخنے کی آواز سن کر ہم بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھے۔ آواز اینکسی کی طرف سے آ رہی تھی۔ ہائے مر گیا۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔ بچاؤ صاحب'' یہ تو فضل بابا کی آواز تھی۔

پاپا بستر سے نکل کر ننگے پاؤں ہی اینکسی کی طرف بھاگے تو میں بھی ان کے پیچھے ہی اٹھ کر بھاگا۔ ممّی اور کوئل بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھیں اور برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔

گیٹ کے قریب ایک دل دہلا دینے والا منظر تھا۔

فضل بابا زمین پر گرے ہوئے تھے اور وہ انھیں بُری طرح زدوکوب کر رہا تھا۔ بابا کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور ان کی پگڑی کھل کر ان کے گلے کے اردگرد اس بُری طرح سے لپٹی ہوئی تھی کہ ان کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں۔ اس حال میں بھی چیختے چلاتے ہوئے فضل بابا نے اس کی ٹانگوں کو زبردستی سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ اسے گیٹ کے باہر جانے سے روک رہا ہو۔

پاپا اور مین نے جا کر بڑی تگ و دو کے بعد فضل بابا کی گلو خلاصی کروائی۔ اور ہانپتے کانپتے نیم جان فضل بابا کو میں برآمدے میں لے آیا۔

اُدھر پاپا نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا ہوا تھا۔ اس کی سرخ انگارہ وحشت زدہ آنکھیں پھر دو بڑے بڑے انڈوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے ان سے دو خونخوار چوزے باہر نکل کر ہم سب کی آنکھیں اُچک لیں گے۔

وہ لگا تار فضا میں گھونسے مار رہا تھا جیسے وہ کسی ان دیکھے وجود سے گتھم گتھا تھا۔

''دیکھ لوں گا میں تجھے مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میری جان لینا چاہتے ہو؟'' بازو اٹھا اٹھا کر شدید غصے میں جیسے وہ کسی کو کوسنے دے رہا تھا۔

اس کی یہ حالت کسی کو بھی خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔

پاپا اسے گھسیٹتے ہوئے اینکسی کی طرف لے جا رہے تھے جبکہ وہ پوری طاقت سے ہاتھ چھڑا چھڑا کر گیٹ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر کوئی آسیب سوار ہو گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے پاپا نے اسے کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

اس واقعہ کے بعد اگلے کئی ہفتے تک وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہا مگر ہمارے پورے گھر پر ایک ماتمی فضا چھائی رہی۔ ممّی سخت متفکر تھیں کہ بچوں کی موجودگی میں اس کا ایسی حالت میں گھر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا بلکہ اسے مینٹل اسائلم میں بھیج دینا چاہیے تھا۔

''وہ پہلے بھی کئی سال وہاں رہ چکا ہے مگر ٹھیک نہیں ہوا اب میں خود اس کا علاج کر رہا ہوں، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' ممّی کو بضد دیکھ کر پاپا بولے۔

''اسے اس وقت توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ایسے ماحول میں رہنا بہت ضروری ہے جہاں اسے یقین ہو کہ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں اسے اس حال

میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' پاپا نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اس کی حالت دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ اگر انسانی دماغ کام کرنا چھوڑ دے تو کہتے ہیں کہ انسان کی کلینکل موت واقع ہو جاتی ہے۔ زندہ دل، نفیس طبع، خوش مزاج، خوش لباس، خوش خوراک اور آرٹ سے محبت کرنے والے شخص کی کلینکل موت تو نہ جانے کب کی ہو چکی تھی؟''

کسی نے چپکے سے کہا۔ ''اس کا فوسل تو بہت پہلے بن گیا تھا مگر زندگی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔''

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا ذہن چند مہینے پیچھے پلٹ گیا جب وہ یہاں نیا نیا آیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حال سے بہت زیادہ بیگانہ تھا۔ وحشت و سراسیمگی اس کی پور پور سے ٹپک رہی تھی مگر تھوڑے ہی عرصے بعد پاپا کی توجہ پا کر وہ کافی پرسکون ہو گیا تھا بلکہ کسی وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بالکل بھلا چنگا ہو کیونکہ وہ بڑی سمجھ بوجھ والی باتیں کیا کرتا تھا۔

کئی چھوٹے موٹے کام اسے اپنے ہاتھوں سے کر کے خوشی ہوتی تھی۔ وہ اپنے کپڑے خود ہی دھو لیا کرتا تھا۔ اینکسی کے چھوٹے سے باغیچے کی دیکھ ریکھ کرنا اور پودوں کو پانی دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ کھانا پکانے کا وہ بہت شوقین تھا۔ ایک دن پاپا سے ضد کرنے لگا کہ وہ اپنے چھوٹے سے کچن میں کھانا خود بنائے گا۔

فضل بابا نے اسے ضروری سودا سلف تو لا کر دے دیا مگر پاپا نے اسے سختی سے ہدایت کی کچن استعمال کرتے وقت اس کا خاص دھیان رکھے۔

ایک دن فضل بابا بتا رہے تھے کہ ''صاحب! انہوں نے سالن اس لگن سے تیار کیا ہے کہ بھون بھون کر جیسے گوشت کا کشتہ مار رہے ہوں۔ مجال ہے کہ مجھے انہوں

نے رسوئی میں قدم رکھنے دیا ہو۔ میں بس باہر برآمدے میں ہی چکر لگاتا رہ گیا۔ پھر چائے بنانے لگے تو چائے کو ایسی پھینٹی لگائی۔ ایسی ایسی پٹخنیاں دیں۔ ایسا دھوبی پڑا مارا کہ چائے بیچاری شاید خوف کے مارے دوبارہ ڈبے میں بند ہونے کی دعائیں کر رہی ہو گی۔''

فضل بابا کی بات سن کر ہم سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''انشاء اللہ وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' پاپا نے فضل بابا کی باتیں سن کر بڑے پر امید لہجے میں کہا۔ ''چائے اس کی کمزوری ہے۔''

ایک دن فضل بابا ممّی سے کہہ رہے تھے کہ وہ قرآن پاک پڑھنا چاہتے ہیں، پاپا نے بتایا تھا کہ وہ خوش الحان تھا اور جوانی میں بہت خوبصورت قرات کیا کرتا تھا۔

مگر یہ کیا؟ جب فضل بابا نے انھیں قرآن پاک دیا تو وہ باقاعدہ پڑھنے کی بجائے صرف ہر لائن پر انگلی پھیر کر بسم اللہ شریف ہی پڑھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ ان کی یادداشت انھیں دغا دے گئی تھی۔

پاپا نے جب یہ سنا تو انھیں بہت دُکھ ہوا۔

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور وقت رفتہ اب پلٹ کر آنے والا نہیں تھا۔

اب باکا کی حالت دن بدن بگڑنی شروع ہو گئی تھی اکثر اس کے کمرے میں سے مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ بیچ بیچ میں بے ہنگم قہقہے سنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے جھگڑ رہا ہو۔ پھر چیزیں اٹھا اٹھا کر فرش پر پٹخنے کی آوازیں آتیں۔

پاپا بتا رہے تھے کہ بیماری کی حالت میں اسے آوازیں سنائی دیتی ہیں اور

ہیولوں کی مانند کچھ چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

اب فضل بابا جب بھی کھانا لے کر جاتے تو وہ غصے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا کرتا تھا۔ ”کبھی کہتے ہیں کہ کھانے میں زہر ہے۔ آپ سب لوگ میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کھانا بہت بدمزہ ہے۔ میں ایسا بدذائقہ کھانا نہیں کھا سکتا صرف شاہی باورچی کے ہاتھ کا پکا لذیذ کھانا کھاؤں گا۔“

فضل بابا تشویشناک لہجے میں بتا رہے تھے کافی دنوں سے اس نے فضل بابا کو بھی کمرے میں گھسنے نہیں دیا تھا۔ کھانے کی ٹرے دروازے کے آگے رکھ کر ہی وہ لوٹ آتے تھے۔

ایک دن پاپا خود کمرے میں گئے تو وہاں خاصے صحت مند چوہے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اور کمرے میں کونوں کھدروں میں جگہ جگہ چھوٹی موٹی رکابیوں اور پلیٹوں میں کھانا رکھا ہوا تھا۔

پاپا کے پوچھے پر اس نے کہا کہ ”سپاہیوں کی فوج تیار کر رہا ہوں۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گے تو طاقت ور کیسے ہوں گے۔ جاپانیوں سے مقابلہ کیسے کریں گے؟“

ایک دن کافی رات گئے اس کے کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ”میرے جسم پر کیڑے چل رہے ہیں یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ کچھ کام کرو۔ میں کیا کام کروں؟“ پاپا اس کا شور شرابہ سن کر جلدی سے اٹھ کر اسے دیکھنے چلے گئے۔

پھر یکایک اس نے سینہ کوبی شروع کر دی اور ہاتھوں کو اس انداز میں حرکت دینے لگا جیسے زنجیر زنی کر رہا ہو۔ میں ادھ کھلے دروازے میں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پاپا جیسے ہی اسے نیند کی گولی دے کر کمرے سے باہر نکلے میں بھاگ کر برآمدے کے ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔ مبادا پاپا مجھے ڈانٹ پلا دیں کہ میں اتنی رات گئے ان

کے پیچھے اینکسی میں کیوں آیا؟

مگراب چند دنوں سے وہ پُرسکون تھا۔

آج خلافِ توقع اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا شاید فضل بابا باہر سے کنڈی لگانا بھول گئے ہیں یا اب دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے سوچا۔

آج باکا کے کمرے کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔ وہ ہارمونیم سامنے رکھ کر زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا اور تصور کر رہا تھا کہ جیسے وہ مغل اعظم، ظلم سبحانی، شہنشاہ اکبر کے دربار کا نام چیں گویّا تان سین ہو کیونکہ تھوڑی دیر بعد اس نے اٹھ کر بے حد تعظیم سے تقریباً آدھا جھک کر شہنشاہ اکبر کو کورنش بجا لاتے ہوئے اپنا تعارف شہنشاہِ موسیقی تان سین کہہ کر کرایا اور ہارمونیم بجانا شروع کر دیا۔

میں کافی دیر تک کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔

معلوم نہیں پاپا کب آ کر چپکے سے میرے پیچھے کھڑے ہو گئے اور خاموشی سے سارا منظر دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد آہستگی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بنگلے میں واپس لے آئے۔

''پاپا آپ کو انکل دوبارہ کب اور کہاں ملے؟'' اب میں نے اسے انکل کہنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے دن پاپا کو کافی خوشگوار موڈ میں دیکھ کر میں نے وقت کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی۔

پاپا نے بتایا کہ ''تقریباً سات سال تک میں تمہارے دادا اور دوسرے چند عزیزوں کے ساتھ جکارتہ میں پھنسا رہا۔ جاپانی تسلط میں وقت بہت مشکل سے کٹ رہا

تھا مگر کوئی جائے امان نہ تھی۔

ادھر ہندوستان میں باقی گھر والوں کی کچھ خیر خبر نہیں تھی۔ مواصلات کا نظام مکمل طور پر درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہمارا کاروبار بھی تباہ ہو گیا تھا۔ تمہارے دادا کو سانس کی بیماری تھی۔ ان حالات میں ان کا مرض شدت اختیار کر گیا مگر علاج معالجے کی نہ کوئی سہولت تھی اور نہ ہی دوائیں دستیاب تھیں بلکہ ہم تو چھپتے پھرتے تھے کہ کہیں جاپانیوں یا ڈچوں کی نظروں میں نہ آ جائیں اور جاسوسی کے الزام میں دھر لئے جائیں۔

جاپانی نہایت ہی ظالم اور شقی القلب تھے۔ انسانی ہمدردی سے تو وہ واقف ہی نہیں تھے۔ بہت ہی بے حس اور ایکدم جذبات سے عاری لوگ تھے۔

تمہارے دادا کے بزنس پارٹنر کے دو بیٹے جاپانیوں کے لیے ڈچوں کی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے جانے کے قریب تھے کہ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے۔ ہمیں ان کی کچھ خیر خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں گئے مگر ڈچ جنہیں ان کی سفید رنگت اور بھورے بالوں کی وجہ سے مقامی باشندے ''بلنڈے'' کہہ کر بلاتے تھے شکاری کتوں کی طرح جگہ جگہ ان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے اور بار بار ہمارے علاقے کے چکر لگانے کے علاوہ ہمارے گھروں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔

پاپا ذرا دم لینے کو رکے پھر بڑے غمگین لہجے میں بولے۔

''تمہارے دادا انہی نامساعد حالات میں سانس کی شدید بیماری کی وجہ سے وہاں انتقال کر گئے اور میں ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکا لیکن یہ پچھتاوا زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔''

پاپا کی اداسی دیکھ کر میں نے کچھ مزید جاننے کے لیے اصرار نہ کیا مگر پاپا خود ہی کہنے لگے (آج شاید وہ باتیں کرنے کے موڈ میں ہیں میں نے سوچا)۔

''1945ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر 1946ء میں ڈچ ایسٹ انڈیز آزاد ہو کر موجودہ انڈونیشیا بن گیا تو ذرا سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا لیکن جلد ہی بچے کھچے ایشیائیوں کو بحری جہازوں میں ٹھونس کر ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ ہمارا جہاز کلکتے کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہوا جہاں سے میں اور میرے چند عزیز بڑی مشکلوں سے امرتسر آ گئے۔''

ان دنوں ہندوستان میں انگریز تسلط سے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر طرف بن کے رہے گا پاکستان۔۔۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں کی گونج تھی۔'' پاپا تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔

پھر بٹوارہ ہو گیا۔ عجیب ابتلا کا وقت تھا۔ ہر طرف جلاؤ گھیراؤ، بلوے اور قتل و غارت سے خوفزدہ مسلمان چھپنے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

آزادی کی اس لڑائی میں ہمارے کئی عزیز کام آ گئے۔ ہم بہ ہزار دقت، گرتے پڑتے، بچتے بچاتے لاہور والٹن کیمپ تک آ پہنچے جہاں انسانی رنج والم کی ان گنت داستانیں چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں۔ بعد میں لاہور شہر میں ہماری آبادکاری ہوئی۔''

''تو پھر انکل آپ کو کہاں ملے؟''

''حالات ذرا قابو میں آئے تو میں نے لاہور میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی لیکن مقامی مینٹل ہوسپٹل کے ساتھ مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ میرے کئی کولیگ وہاں کام کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً کئی مشکل کیسز کے لیے مجھ سے کنسلٹ کرتے رہتے تھے۔'' پاپا نے بڑے پروفیشنل انداز میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔

''ڈاکٹر اختر نے مجھے ایک مریض کی کیس ہسٹری پر مشورے کے لیے انگیج کیا

جو کافی عرصے سے مینٹل ہوسپٹل میں تھا۔'' پاپا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''قیام پاکستان کے وقت ڈاکٹر اختر کی ڈیوٹی والٹن کیمپ میں لگی ہوئی تھی اور یہ مریض انہوں نے وہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔''

ڈاکٹر اختر بتا رہے تھے کہ ''مریض کی یادداشت کافی متاثر ہو چکی ہے لیکن کبھی کبھی بالکل ہوش مندانہ گفتگو بھی کرتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق میڈیکل کے پیشے سے رہ چکا ہے۔''

میں فائل سٹڈی کر رہا تھا جبکہ ڈاکٹر اختر آہستہ آہستہ گفتگو کر کے مریض کے سماجی پس منظر کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ ''مریض کے میڈیکل نوٹس واضح طور پر شیزوفرینیا (Schizophrenia) کی بیماری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے رویے (Behaviour) میں وہم اور وسوسوں (Delusion) کے ساتھ ساتھ فریب نظر اور فریب خیال (Hallucination) کی کیفیت بھی موجود ہے جس میں اسے کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ہیولے بھی نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں مریض کی چکھنے، چھونے اور سونگنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اس مریض کے کیس میں تو سمعی (Auditory) اور بصری (visual) دونوں طرح کا ہولوسی نیشن موجود ہے۔'' میں نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

''گو کہ مرض کافی ایڈوانس سٹیج پر جا چکا ہے مگر کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر اختر نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے اگلی ملاقات پر میرا مریض سے ملنے کا پروگرام طے کر دیا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''پہلی ہی ملاقات میں مریض کو کچھ دیر دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک زبردست چھناکا ہوا۔ جیسے بہت تند و تیز آندھی ایکدم آ کر منڈیر پر رکھے پانی کے سارے گھڑے اس بُری طرح الٹ دے کہ ٹوتی ہوئی ٹھیکریوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کی ہر چیز شرابور ہو جائے۔ میری بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔

لیکن میں نے مریض پر بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ اچانک پہچان سے اس کو مزید ذہنی صدمہ پہنچنے کا احتمال تھا۔ لیکن میں آج تک حیران ہوں کہ یونس جگارتہ سے ہندوستان اور پھر والٹن کیمپ کیسے پہنچا؟''

''تو انکل نے کب آپ کو پہچانا؟''

کچھ دیر خاموش رہ کر پاپا کہنے لگے۔

''میں باقاعدگی سے یونس کو دیکھنے ہسپتال جاتا رہتا تھا۔ نئے ٹریٹمنٹ پلان اور میری توجہ سے رفتہ رفتہ اس کی حالت سدھرنے لگی اور وہ بھول بھلیوں میں سے راستہ بناتا ہوا ایک دن پہچان کی سرحد پر آن پہنچا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت دیر تک خاموشی اور آنسوؤں کی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔''

''اس قدر باتونی یونس پر چپ کا سایہ پڑ چکا تھا۔ میری باتوں کے جواب زیادہ تر ہوں ہاں میں ہی دیتا تھا۔'' پاپا نے نہایت افسردگی سے کہا۔

ایک دن اس کے نہایت مختصر سے سامان میں سے ایک بے حد بوسیدہ ڈائری برآمد ہوئی۔ جسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں بہت دیر تک روتا رہا۔

اب پاپا بے حد آزردہ ہو چکے تھے۔

''پتہ نہیں۔ اس نے کب اور کیسے یہ ڈائری لکھی ہو گی اور وہ جاپانیوں کی قید سے کیسے نکلا؟''

کمرے میں ایک گھمبیر خاموشی کافی دیر تک چھائی رہی۔

پاپا نے کچھ دیر اسی کیفیت میں رہنے کے بعد ڈائری کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

''وعدے کے مطابق یونس مجھ سے ملنے جکارتہ آیا تھا مگر وہاں جاپانیوں نے اسے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اسے دشمن کا ایجنٹ سمجھ کر انفارمیشن اگلوانے کے لیے اس پر کئی غیر انسانی حربے استعمال کیے جس سے اس کی ذہنی اور دماغی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔'' اتنا کہہ کر پاپا ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

میں نے بھی وقت کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

دوسرے دن پاپا کی رائیٹنگ ٹیبل کی دراز میں پڑی ہوئی ایک بوسیدہ سی ڈائری دیکھ کر میں چونک گیا۔

جیسے ہی میں نے ڈائری کھول کر پڑھنا شروع کیا مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ یہ محض ایک ڈائری نہیں تھی بلکہ جاپانیوں کے لرزہ خیز مظالم کی مکمل ایف آئی آر تھی۔ میں ڈائری پڑھتا رہا اور روتا رہا۔ کٹی پھٹی بوسیدہ سی ڈائری جس کے کئی صفحے تو مکمل طور پر پڑھنے کے لائق بھی نہیں رہے تھے اس پر میرے آنسو مزید گلکاریاں کرنے لگے۔

چند صفحے پلٹے تو لکھا تھا'' جاپانی بہت شقی القلب لوگ ہیں۔ ہر قسم کے انسانی جذبوں سے عاری ہیں۔ بے حد میکانکی انداز میں بات کرنے والے۔ میرے لاکھ بتانے کے باوجود انہوں نے مجھے جکارتہ میں جاسوسی کے شبے میں گرفتار کر لیا ہے۔ اب پتہ نہیں کیا ہوگا؟

آگے چل کر لکھا تھا۔ ''معلوم نہیں ہم کہاں ہیں؟ چوبیس گھنٹوں میں صرف دو کپ پانی ملتا ہے۔ وگرنہ سمندر کا نمکین پانی پینا پڑتا ہے۔ بہت کم کھانے اور سخت دھوپ میں گھنٹوں مشقت کرنے سے ڈی ہائیڈریشن ہو جاتا ہے۔ اکثر قیدی، ہیضہ، ڈائریا، پیچش اور بخار میں مبتلا رہتے ہیں۔''

اگلے چند صفحے خالی تھے۔ ''آج کچھ قیدی کھانا چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ بہت سخت سزا دی گئی۔ کئی قیدیوں کے سر قلم کر دیئے گئے اور کچھ قیدی فائر اسکواڈ کی گولیوں کی بوچھاڑ سے اپنے ہاتھوں سے کھودی گئی قبروں میں جا گرے۔''

آگے کئی صفحات پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے پڑھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

''آج یونٹ 731 دکھانے کے لیے لے گئے جہاں زندہ انسانوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ یہ Cannibalism کا نہایت دہشتناک منظر تھا۔ انسان اس قدر وحشی بھی ہو سکتا ہے؟ میری سوچ اس سے آگے نہیں جا رہی۔''

اگلے چند صفحوں پر آڑی ترچھی لکیریں تھیں جو شاید لکھنے والے کی ذہنی حالت کی غمازی کر رہی تھیں۔

''کس قدر تکلیف دہ منظر ہے۔ اذیت پہنچانے کی بھی حد ہوتی ہے۔ Vivisection دیکھ کر تو میری طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ بے ہوش کیے بغیر ہی قیدیوں کی ٹانگیں، بازو، کاٹے جا رہے تھے۔ ان کی دردناک چیخیں سن کر میں ان کی موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ نہ جانے میری باری کب آ جائے؟ ایسی وحشت، ایسی بربریت۔''

آگے کئی صفحات پر Doodling کی ہوئی تھی۔

''آج چند قیدیوں کے پیٹ پر بڑے بڑے چوہے رکھ کر اوپر ایک برتن کس کر باندھ دیا گیا ہے۔ چوہے گوشت کھا کھا کر بدن میں سوراخ کر کے دوسری طرف نکل رہے ہیں۔ قیدیوں کی حالت غیر ہو چکی ہے۔۔۔ قریب المرگ ہیں۔۔۔ مجھے وارننگ دی جا رہی ہے کہ جلد یا بدیر میرا حشر بھی ویسا ہی ہونے والا ہے اگر میں نے انھیں ڈچ فوجیوں کے بارے میں کوئی انفارمیشن نہ دی تو۔۔۔''

اگلے چند صفحے خالی تھے۔

''میں انھیں یقین دلا دلا کر تھک گیا ہوں کہ میں کوئی جاسوس نہیں ہوں۔۔۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں۔۔۔ میرے ساتھ ان کا رویہ تھوڑا سا مختلف ہے کیونکہ میں جاپانی میں بات چیت کر لیتا ہوں۔ جس سے یہ کافی کنفیوژن کا شکار ہیں کہ شاید میں واقعی ہی جاسوس ہوں، جاپانی زبان جاننا ہی اب میرے لیے مصیبت بن چکا ہے۔''

اگلے چند صفحے پھٹے ہوئے تھے۔

''کچھ قیدیوں کو پیٹ بھر کر پانی پلا کر آج صبح موٹے تازے گارڈز ان کے پیٹے پر چھلانگیں مار رہے تھے۔ قیدیوں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے جس سے وہ سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ پانی ان کے جسم کے ہر سوراخ سے بہنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ قیدی اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے خداؤں سے موت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔''

اگلے دو صفحے شاید آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔

''میرا انسان اور انسانیت دونوں پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔۔۔ اب کچھ اور دیکھنے کی خواہش نہیں رہی۔ کاش میرا خدا مجھ سے یہ آنکھیں چھین لے یا پھر میرے ہوش و حواس ۔۔۔ میں انسانیت کی تذلیل کے یہ مونوگرام نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ نہیں

دیکھ سکتا۔۔۔''

اگلے چند صفحے پھر پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور لکھائی پھیل کر پڑھنے کے لائق نہیں رہی تھی۔

''آج کے دو منظر میری آنکھوں کی پتلیوں میں جم گئے ہیں۔ دو قیدیوں کی ٹانگوں سے بانس باندھ کر ان کے وجود کو درمیان سے دولخت کر دیا گیا۔۔۔ یہ سچ ہے کہ انسان واقعی ظالم اور جاہل ہے۔''

اگلے صفحے پر پھر ڈوڈلنگ (Doodling) کی ہوئی تھی۔

''سنا ہے کہ آج پریشر چیمبر میں چند قیدیوں کو ڈال کر پریشر اتنا بڑھا دیا گیا کہ ان کی آنکھیں شدید دباؤ سے اُبل کر باہر آ گریں۔''

میں اس سے مزید نہ پڑھ سکا اور ڈائری بند کر کے واپس دراز میں رکھ دی۔

روتے روتے میری ہچکی بندھ چکی تھی۔ ایسی وحشت۔ ایسی بربریت۔۔ ایسے لرزہ خیز مظالم دیکھنے کے بعد اگر کوئی دماغی توازن کھو دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

میں نے بڑے دُکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔

''حضرت یونس علیہ السلام آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے مچھلی کے پیٹ میں سے صحیح سلامت نکل آئے تھے تو کیا ڈاکٹر یونس کو کسی نے بھی اسم اعظم کے بارے میں نہیں بتایا تھا جسے پڑھ کر وہ بھی تاریکیوں سے روشنیوں میں آ جاتے؟''

آج مجھے انکل یونس سے صرف ہمدردی ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ میرا سر بے پناہ عقیدت واحترام سے ان کی عظمت و ہمت کے آگے جھکا جا رہا تھا۔

''باکا کا کیا مطلب ہے؟ اور انکل کا یہ نام کیسے پڑا؟''

انکل یونس کے واپس مینٹل اسائلم چلے جانے کے کئی دنوں بعد آج میں نے پاپا سے پوچھا تو آج خلافِ معمول مجھے انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کرنے کی بجائے وہ بتانے لگے۔

''دراصل باکا جاپانی زبان میں پاگل، مجنوں یا مخبوط الحواس شخص کو کہتے ہیں۔ جاپانیوں کے کیمپ میں جب یونس کی دماغی حالت مخدوش ہوئی ہو گی تو انہوں نے شناخت کے لیے اس کے گلے میں ایک تختی لٹکا دی تھی جس پر لفظ ''باکا'' لکھا ہوا تھا۔''

ذرا رُک کر پاپا پھر کہنے لگے۔

''ڈاکٹر اختر بتا رہے تھے کہ لاہور کے والٹن کیمپ میں ڈیوٹی کے دوران جب یونس انھیں ملا تو وہی تختی اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی اور تب سے اس کا نام ''باکا'' پڑ گیا۔

○

میں سوچتی ہوں میرا خواب تو مکمل تھا
نہ جانے خواب کی تعبیر کیوں ادھوری ہے؟
(رضیہ اسماعیل)

آدھی چادر

دھول مٹی سے اٹے ہوئے کچے پکے راستے کے نشیب و فراز کو تسخیر کرتی ہوئی ہماری لینڈ کروزر بڑی سبک رفتاری سے واہگہ اٹاری بارڈر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

ہم جیسے جیسے بارڈر ایریا کے قریب آ رہے تھے ایک نامعلوم سی خاموشی ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی جیسے چمکیلی دھوپ میں یک لخت سورج کے سامنے ایک سیاہ بدلی آ کر روشنی کا راستہ روک لے اور چاروں اور تاریکی سی پھیل جائے لیکن اس خاموشی پر افسردگی سے زیادہ سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔

کافی دیر سے اونچی آواز میں کسی کنٹرورشل موضوع پر بحث کرتے ہوئے طارق بھیا اور عنیزہ آپا کی آوازیں بھی سرحد کے احترام میں آہستہ آہستہ نیچی ہوتی جا رہی تھیں۔

سمن اور راینہ جو کچھ دیر پہلے تک ایک دوسرے کو الٹے سیدھے لطیفے سنا سنا کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں وہ بھی اب خاموش ہو چکی تھیں۔

اور میرا ذہن ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان کہیں زقندیں بھر رہا تھا۔

عنیزہ آپا کئی برسوں کے بعد امریکہ سے اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گذارنے لاہور آئی تھیں۔

جولائی، اگست کی پاگل کر دینے والی لاہور کی گرمی جس میں چیل بھی اپنے

گھونسلے میں انڈے کو یتیم کر دے۔ آپا کا اصرار تھا بچوں کو واہگہ اٹاری بارڈر پر فلیگ چیجنگ تقریب ضرور دکھائی جائے۔

''انہیں بھی تو پتہ چلے کہ اس ملک کے حصول کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ کس طرح خاک وخون کے دریا عبور کر کے عزتوں اور جانوں کے نذرانے پیش کر کے انہوں نے اس آزاد سرزمین پر قدم رکھا تھا۔''

عنیزہ آپا بات کرتے کرتے کافی جذباتی ہو گئیں۔

ادھر واہگہ اٹاری بارڈر پر پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے فضا میں ایک زبردست ارتعاش پیدا کر رکھا تھا۔

''لگتا ہے تقریب شروع ہو چکی ہے۔'' عنیزہ آپا نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ذرا جلدی قدم اٹھائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر کچھ راستہ پیدل چل کر ہمیں ''باب آزادی'' تک جانا تھا۔

دھول مٹی سے اٹے، اونچے نیچے، کچے پکے راستے پر چلتے ہوئے پاؤں اپنے محور سے ہٹ ہٹ جاتے تھے۔ الٹے سیدھے پڑتے پاؤں اور دل کی بے ترتیب ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہستہ آہستہ بارڈر کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔

یہ ہمارے لیے ایک۔ بالکل انوکھا تجربہ تھا کیونکہ ہم پہلی مرتبہ ہی یہاں آ رہے تھے۔

آزدی کے نشے میں مخمور سحر زدہ سے ماحول کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے انسانوں کے ساتھ ساتھ دھرتی بھی ایک لچکیلی شاخ کی مانند مستی میں جھوم رہی تھیں۔

''پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد'' کے دل افروز نعرے فضا میں ہر سو پھلجھڑیاں سی چھوڑ رہے تھے۔

میرے دل کے کہیں بہت اندر سے دعا نکلی "بے شک پاکستان تا ابد قائم رہے گا۔ اس کی تعمیر میں میرے پرکھوں کا لہو بھی شامل ہے جو کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔"

نہ جانے کب چند مضطرب سے آنسو آزادی کے حصول کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے والے لاکھوں شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رخساروں کی زمین پر پاؤں پاؤں چلنے لگے اور مجھے انہیں پونچھنے کی چنداں ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔

"آزادی بھی کیا چیز ہے؟" دل نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں یہ وہ نشہ ہے جس کا خمار زندگی بھر نہیں اترتا۔"

میں نے بھی ہولے سے جواب دیا۔

"لیکن آزادی کی قدر و قیمت کا ادراک ہونا ہر شخص کا مقدر نہیں ہوتا۔"

دل کی سرگوشیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی کہیں سے والٹیر کی آواز سماعتوں کو ریشم جیسے نرم ہاتھوں سے سہلاتی ہوئی ابھری "خدا اور آزادی زندگی کی دو بڑی حقیقتیں ہیں اور باقی سب حقیقتیں اس کے گرد گھومتی ہیں۔" یہ سن کر دل نے چپ سادھ لی جیسے اسے اس کی بات کا جواب مل گیا ہو۔

باب آزادی پر نظر پڑتے ہی میرے تیز تیز چلتے ہوئے قدم یک لخت رُک گئے اور میں کتنی ہی دیر تک نہایت شان سے ایستادہ باب آزادی کو اور کبھی دونوں ملکوں کی سرزمین کو جدا کرتی ہوئی سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزرنے والی ٹیڑھی میڑھی ایک لکیر کو سوچ بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی سرحد ہے جس پر لگی ایک ہلکی سی آہنی باڑ کے ذریعے اس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے؟

تو یہ ہے لائن آف کنٹرول (LOC)۔ میں نے خود سے کہا۔

''ہاں۔ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی لکیر...... زمین پر کھینچی جانے والی بدقسمت ترین لکیر۔ جس نے پنجاب کے دل کو چیر کر رکھ دیا۔''

تاریخ نے جیسے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اور اس دل سے اس قدر خون بہا کہ دھرتی سرخ ہوگئی۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کے پانیوں کے رنگ تبدیل ہو گئے۔''

میں نے نہایت دکھی دل کے ساتھ کہا تو دور کہیں فضا میں امرتا پریتم کی غم زدہ آواز گونج اٹھی۔

''اج آکھاں وارث شاہ نوں
کدے قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا
کوئی اگلا ورقہ پھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی
توں لِکھ لِکھ مارے وین
وے اج لکھاں دھیاں روندیاں
تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دیا دردیا
اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں
تے لہو دی بھری چناب......''

میں اس سے زیادہ نہ سن سکی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میری اور

امرتا پریتم کی دلی حالت سے بے خبر بارڈر کے دونوں طرف معمول کی زندگی میں مصروف کسان کھیتی باڑی میں مشغول تھے۔ ڈھور ڈنگر اِدھر اُدھر ہریالی پر منہ مار رہے تھے۔ سرحدی پابندیوں سے بے نیاز پرندے آزادانہ بارڈر کے آر پار جا رہے تھے۔ نیلگوں آسمان نے اپنی چادر سرحد کے دونوں طرف یکساں طور پر تان رکھی تھی۔

میں نے سوچا ''فطرت کے وہی رنگ ڈھنگ ہیں مگر سرحد کے دونوں پار رہنے والوں کی زندگیوں میں بٹوارے سے جو عظیم تغیر و تبدل رونما ہوا ہے اس کا صحیح ادراک ان کے سوا اور کون کر سکتا؟''

چند بچے جو کچھ دیر پہلے تک کھیتوں کی منڈیروں پر لکن میٹی کھیلتے ہوئے کھیتوں میں جا چھپے تھے اب تھک ہار کر پگڈنڈی پر ستانے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔

زمینی حقائق سے جیسے بے نیاز، مگر سرحد کے دونوں طرف لگنے والے نعروں کی طرف متوجہ ہو کر گاہے بگاہے دونوں طرف کے کسانوں کی طرف سے کبھی ''پاکستان زندہ باد''، تو کبھی ''ہندوستان زندہ باد'' کے نعروں کی ہلکی سی گونج فضا میں بکھر جاتی تھی۔

لگتا تھا سرحد کے دونوں طرف کی نعرے بازی ان لوگوں کے لیے ایک معمول کی چیز بن چکی تھی جس پر کسی قسم کے جذباتی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر وہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول تھے۔

''پاکستان زندہ باد'' کے سُرمگیں نعرے فضا کے تقدس میں ہر لحظہ اضافہ کر رہے تھے۔

میں بہت غور سے سرحد پر بنے دیوہیکل آہنی دروازوں کے آر پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے شانے پر اچانک کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا بشن سنگھ تھا جو ابھی تک تذبذب کی کیفیت پوچھ رہا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں چلا گیا؟

''کھول دو'' کا سراج الدین۔ مسلی کچلی، لٹی پٹی، نچڑی نچڑائی زندہ درگور سکینہ کو پاکر خوشی سے نہال ہو رہا تھا جیسے سکینہ کا جنم آج ہی ہوا ہو۔

پاس ہی ''ٹھنڈے گوشت'' والا ایشر سنگھ شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا جبکہ اُسے خونخوار آنکھوں سے دیکھتی ہوئی کلونت کور کے سینے کا زیرو بم بتا رہا تھا کہ جیسے وہ عورت کی بجائے ایک زخمی شیرنی میں تبدیل ہو چکی ہو کیونکہ شکار کو پوری طرح پنجوں میں دبوچ لینے کے باوجود عین منہ میں نوالہ ڈالتے وقت پلیٹ اس کے آگے سے ہٹالی گئی تھی۔

قاسمی کا پرمیشر سنگھ اپنے کھلے کیسوں اور زخمی وجود کے ساتھ اختر اور کرتارے کی انگلی پکڑے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کرتارا اُسے مل گیا تھا۔ لیکن پاس کھڑی امر کور اسے نہایت خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے کہہ رہی تھی:

''اگر تجھے تیرا کرتارا مل گیا ہے تو پھر اختر کی انگلی پکڑے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جانے دو اسے...... اب چھوڑ دو......''

''جھلی...... اتنا بھی نہیں جانتی کہ محبت سے پکڑی ہوئی انگلی کو چھوڑ دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔'' پرمیشر سنگھ نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے اچانک یوں لگا جیسے پاکستان زندہ باد کے نعروں میں کچھ اور آوازیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ ایک عجیب سا شور زبردست انگڑائی لے کر میرے چاروں طرف بیدار ہو چکا تھا۔

''یہ کیسا شور ہے؟'' میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فضا میں غیر مرئی وجود تلاش کرنے لگی۔

یکا یک وقت کا آئینہ ایک زبردست چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

ان گنت کرچیوں میں کوئی ایک چہرہ بھی مکمل نہیں تھا۔ آدھے چہرے، پورے

چہرے، کٹے پھٹے چہرے...... اگر آنکھ ہے تو ناک غائب...... رخسار ہیں تو لب ندارد۔ بے ترتیب چہرے...... دہشت زدہ چہرے...... بنتے بگڑتے چہرے......

کون ہیں یہ سب لوگ؟ میں خوف سے تقریباً چیخ اٹھی مگر کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے سب نے آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا ہو۔ میرا سانس رکنے سا لگا۔ تنگ جگہوں سے مجھے ہمیشہ ہی بہت وحشت ہوتی ہے اس لیے میں جلدی سے اپنے اردگرد اکٹھے ہونے والے ہجوم کا گھیرا توڑ کر باہر نکل آئی اور کھلی فضا میں لمبی لمبی سانس لے کر اپنے اوسان بحال کرنے لگی۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ مجھے اپنی اپنی کہانیاں سنانے کے لیے بے چین تھے۔

''میں خوشونت سنگھ کا جگا ہوں۔''

''میں نوراں ہوں۔''

''میں اقبال سنگھ ہوں۔''

''میں قدرت اللہ شہاب کی دلشاد ہوں۔ یہ مصطفیٰ خان ہے۔''

''میں ملّا علی بخش ہوں۔''

''میں راجندر سنگھ کی لاجونتی ہوں۔ یہ سندر لال ہے۔''

''میں کرشن چندر کا اوم پرکاش ہوں۔''

''میں صدیق ہوں۔''

''میں لالہ بانشی رام کھتری ہوں۔''

''میں پشپا ہوں۔''

''میں کملا کر۔''

''میں روزی۔''

''میں شنکر۔''

''میں بیلا، میں بتول۔''

''میں فارس روڈ کی طوائف ہوں۔''

ان سب کی آوازیں میری سماعتوں پر پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑ رہی تھیں میں نے بے حد تکلیف سے تقریباً چیختے ہوئے کہا ''بس چپ ہو جاؤ، خدا کے واسطے، چپ ہو جاؤ۔''

آوازوں کے بے ہنگم شور میں یکا یک کچھ دردناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جنہیں سن کر وقت کا سینہ شق ہو گیا۔

''میں کرشن چندر کی زینب ہوں۔''

''میں پارو ہوں۔''

''میں شام کور ہوں۔''

''میں بیگم ہوں۔''

''ہم جو تخلیق کے علم بردار ہیں ہمیں کوئی نہیں مار سکتا کوئی ہماری عصمت دری نہیں کر سکتا۔''

زینب کی غضب ناک آواز فضا کو چیرتی ہوئی ابھری۔

''ہم کل کی مائیں بہنیں آج طوائفوں سے بدتر ہو چکی ہیں۔''

شام کور کی آواز کے ساتھ پارو اور بیگم کی آوازیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

تاریخ کے قلمدان سے سیاہی جوش مار کر یک لخت باہر آ کر گری اور وقت کے کورے کاغذ پر ایک بدنما سیاہ لکیر چھوڑ گئی۔

تاریخ بے لباس ہو چکی تھی۔

وحشت و بربریت کا جنونی رقص...... صدیوں پرانے بھائی چارے کی گھڑیاں...... محبتوں کے پُشتارے...... مان سنمان...... عہد و پیمان...... کچھ بھی تو کام نہ آیا۔

تاریخ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''گوتم بدھ...... گیتا...... وید...... قرآن...... گرنتھ...... سب اپنی جگہ اونچے استھانوں پر پڑے رہ گئے۔'' میرے ہونٹوں پر سسکی ابھری۔

''الورا اجنتا...... تاج محل...... ادب...... آرٹ...... گیت...... سنگیت......

کبیر، تلسی داس...... ولی...... غالب...... ٹیگور...... اقبال...... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا...... کچھ بھی تو انسانوں کی نفرت کا راستہ نہ روک سکا۔ یہاں تک کہ سب تہذیب وتمدن جل کر خاک ہوگیا۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ست سری اکال...... راج کرے گا خالصہ...... باقی رہے نہ کوئی...... ہر ہر مہادیو...... رادھے شام...... جو مانگے ہے پاکستان اس کو دے دو قبرستان...... رنگے اور مُودے کا بدلہ لینا ہے...... خون سے مُسلوں کے اس داغ کو دھونا ہے۔''

بس سب کچھ انسانیت سوز نعروں میں تحلیل ہوگیا۔

یہ کہتے ہوئے تاریخ کے سینے سے ایک زبردست ہوک اٹھی۔

میں اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی سوچ رہی تھی کہ:

کیا بٹوارے کے زخموں کا کوئی مرہم ہے؟

کیا ہجرت کی زہر آلود یادوں کا کوئی تریاق ہے؟

کیا کٹے ہوئے پستانوں سے بہنے والے مقدس دودھ کا کوئی حساب ہے؟

کیا عصمتوں کے چاک رفو کرنا ممکن ہے؟

کیا دونوں ٹانگوں کے درمیان بہنے والی خون کی ندیوں کا کوئی کنارہ ہے؟

کیا بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں میں دم توڑ دینے والے خوابوں کا کوئی شمار ہے؟

کیا نیزے کی انیوں پر چڑھی ہوئی دریدہ نسل کی کوئی دادرسی ہے؟

کیا رستے میں رہ جانے والوں کے بے گور و کفن...... تعفن زدہ...... اور سڑاند مارتے ہوئے جسموں کا کوئی احترام ہے؟

لیکن میری بات کا جواب شاید کسی کے بھی پاس نہیں تھا کیونکہ وقت کا پنچھی پر پھیلائے کہیں بہت دور خلاؤں میں گم ہو چکا تھا اور تاریخ نے نوشتہ تقدیر لکھ کر اپنے کاغذ قلم سمیٹ لیے تھے۔

''انسان کے ظالم، جاہل اور جلد باز ہونے کی گواہی تو قرآن صدیوں پہلے ہی دے چکا ہے۔'' دل سے آواز ابھری۔

ہاں مگر انسانیت اور احترام آدمیت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟

میں نے قدرے درشتگی سے جواب دیا جو کہ جواب سے زیادہ ایک سوال تھا۔

''انسان اور انسانیت؟'' دل نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''جانتی ہو انسان کا اصل نام بشر ہے۔ وہ ''ب ش ر'' یعنی تین لفظوں کا مجموعہ ہے جس کے لغوی معنی ''بشارت دینے والا'' کے ہیں۔ اس میں سے صرف اگر ''ب'' کو ہٹا دیا جائے تو پیچھے دو حرف کا مجموعہ یعنی ''شر'' رہ جاتا ہے۔

اگر ''ب'' کو خیر کے ہم پلہ سمجھ لیا جائے تو پھر باقی شر کے سوا انسان میں اور کیا رہ جاتا ہے؟ دل نے جیسے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر انسان پر ابلیسیت کی ترغیبات حاوی ہو جائیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو وقت نے انسانی تاریخ کی اس سب سے بڑی ہجرت کے موقعہ پر ہوتے ہوئے دیکھا۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بھلا غاروں میں رہنے اور پتوں سے تن ڈھانپنے والے وحشی انسانوں کو بے لباس ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟''

میں ابھی دل کی اس بات کا جواب دینے کے بارے میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ عنیزہ آپا کی آواز نے میری محویت کو توڑ دیا۔

''کہاں گم ہو اتنی دیر سے تم؟'' آپا کی آواز سن کر میں بادل نخواستہ اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔

''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے اب اتنے تواتر سے سنائی نہیں دے رہے تھے ''شاید تقریب ختم ہونے کو ہے؟'' میں نے سوچا۔

''یہی دھول اور مٹی سے اٹی ہوئی سڑک ہے نا جس پر چل کر ہمارے آباؤاجداد کے لٹے پٹے قافلے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔''

عنیزہ آپا کی آواز مجھے جیسے کئی زرنوں کا فاصلہ طے کر کے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

ان کے لہجے میں ایک انوکھا سا درد تھا۔ ان کے سوال میں ہی ان کا جواب موجود تھا۔

عنیزہ آپا یقیناً مجھ سے جواب نہیں مانگ رہی ہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کو دہرا رہی ہیں۔ میں نے خود سے کہا۔

وقت کے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب سرکنے شروع ہو گئے۔

صحن میں بیٹھی نانی ماں بتا رہی تھیں کہ جب ان کا ٹرک قیام پاکستان کے کئی مہینوں کے بعد ملٹری کی معیت میں واہگہ اٹاری بارڈر پر پہنچا تو وہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ٹرک سے نیچے اتر آئیں۔

''میں پاکستان کی سرزمین کو ٹرک کے پہیوں تلے روندتے ہوئے نہیں بلکہ

پیدل چل کر جانا چاہتی ہوں۔''

نانی نے ملٹری پولیس سے کہا تو وہ بھی نانی کے جذبے کے آگے خاموش ہو گئے۔

پھر نانی ماں نہ جانے کتنی ہی دیر تک خاک آلود چہرے کے ساتھ حرم کی طرح پاک زمین پر سجدہ ریز رہیں۔

ایک طغیانی تھی کہ آنکھوں سے تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''پتہ نہیں یہ نئے وطن میں آنے کی خوشی کے آنسو تھے یا پیچھے رہ جانے والے وطن کو چھوڑنے کا ماتم تھا؟'' میں نے سوچا۔

دل دریا سمندروں ڈونگھے تے کون دلاں دیاں جانے ہُو؟

فضا کو چیرتے ہوئے چند بول جیسے میری سوچوں کی تائید کر رہے ہوں۔

عنیزہ آپا اور میں نے جھک کر زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اس طرح چومی جیسے حجر اسود کو بوسہ دے رہے ہوں۔

ادھر چمکیلی دھوپ میں صحن میں تخت پوش پر بیٹھی نانی ماں نے پھر سے یادوں کے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی تھی...... وہی ہزاروں بار دہرائی ہوئی بٹوارے کی کہانی...... تقسیم کی داستان...... ہجرت کے قصے۔

جب سے ہم نے آنکھ کھولی تھی اس کہانی کے علاوہ ہم نے کوئی اور کہانی سنی ہی نہیں تھی مگر نانی کا کتھارسس کسی طرح بھی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''پکی عمروں میں بسے بسائے گھر، جن کی ایک ایک اینٹ کے ساتھ دکھ سکھ کی سانجھ ہو، چھوڑ دینا اور پھر بھلا دینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔''

ہوا کے دوش پر جیسے ایک تحریر اُبھری تو میں خاموش ہو گئی۔

''جب پنڈ کے منادی گھر کے اونچے مینارے پر چڑھ کر نقارے پر ڈگا لگا کر

منادی کرنے والے نے کہا کہ اب ہندوستان تقسیم ہو گیا ہے۔ بٹوارا ہو چکا ہے جسے یہاں رہنا ہے وہ رہ سکتا ہے اور جو یہاں نہیں رہنا چاہتا وہ پاکستان چلا جائے۔'' ایک دن نانی بتا رہی تھیں۔

''یہ اعلان سن کر مانو ہمارے دل جیسے ہزاروں لاکھوں ہاتھوں نے اپنی ہتھیلیوں میں لے کر مسلنے شروع کر دیئے ہوں۔ ایک تھرتھلی سی مچ گئی۔ بس حشر کا سماں تھا۔

توے پر پڑی روٹی جل کر وہیں سواہ ہو گئی۔

گھر کے در و دیوار اجنبی بن گئے۔

صحن میں پیپل کے درخت پر ہلارے لیتی ہوئی پینگ ٹہنے سمیت ٹوٹ کر زمین پر آ گری۔

پنچھی پکھیرو سب اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر اڑ گئے۔''

اتنا کہہ کر نانی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرنے لگیں۔

''نانی! آپ لوگوں کو پتہ تو تھا کہ قیام پاکستان کی تحریک کتنے زور شور سے چل رہی تھی اور ہر گزرتے سمے کے ساتھ بٹوارے کا وقت قریب آ رہا تھا؟''

میں نے نانی سے سوال کیا تو وہ بولیں:

''ہاں! ہمیں بے شک علم تھا کہ قیام پاکستان کے خواب کو تعبیر ملنے والی تھی۔ تمہارے نانا تو زیادہ تر الہ آباد میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے تھے مگر تمہارے بڑے ماموں اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے اور مسلم لیگ کے بڑے پرجوش کارکن تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے تو ملک میں ہونے ولای سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے ہمیں بتاتے رہتے تھے کہ کس طرح قائداعظم محمد علی جناح نے یونیورسٹی میں اپنے خطاب میں کہا تھا کہ ''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب

ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے...... وطن اور نسل نہیں۔''

''قائد نے اور کیا کہا؟'' میں نے پرسوز لہجے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ قائداعظم کہہ رہے تھے:

''ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیبوں، سماجوں اور متضاد طرز ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قوموں کا آپس میں ادغام خارج از امکان ہے۔''

تو پھر کیا ہوا کہ آپ تقسیم کے اعلان پر اس قدر غیر یقینی صورت حال کا شکار ہو گئے؟

''ہم تو بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے کہ امرتسر پاکستان میں آئے گا مگر وہ تو ہندوستان کو دے دیا گیا اور......''

نانی نے ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ پاس ہی بیٹھے اخبار بینی کرتے ہوئے نانا ابا بول اٹھے:

''دراصل پنجاب کی مسلمان آبادی کی اکثریت والی تحصیلیں اور اضلاع جن میں پٹیالہ، گورداسپور، انبالہ، جالندھر، نکودر، فیروز پور اور زیرہ شامل تھے، ابتدائی نقشوں کے مطابق پاکستان کو دیئے جانے تھے مگر نہرو، پٹیل، وی پی مینن اور گاندھی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈالا اور اسے ساتھ ملا کر ریڈ کلف ایوارڈ کو تبدیل کروایا اور یہ علاقے ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ اس تبدیلی کا اعلان تقسیم کے اعلان کے تین دن بعد کیا گیا جس نے پنجاب میں ہر طرف گویا ایک آگ سی لگا دی۔ ظلم و جور کی آندھیاں بہت زور و شور سے چلنے لگیں، نفرت کے گہرے سیاہ بادلوں نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فتنہ و فساد کی آگ ہمارے چاروں طرف پھیل گئی اور ہم بے حد غیر محفوظ ہو گئے۔''

اتنا کہہ کر نانا ابا خاموش ہو گئے۔ شاید کسی بہت ہی تلخ یاد نے انہیں سوگوار کر دیا تھا۔

نانا ابو کی سوگواری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوالوں کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے اٹھنا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔

''بیٹا یہ ضروری ہے کہ آپ لوگوں کو اپنی تاریخ سے مکمل واقفیت ہو کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔'' یہ بات ہمارے قائد نے پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقعہ پر 14 اگست 1948ء میں اپنے خطاب میں کہی تھی۔

یہ ملک بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا ہے اور آپ کو اس کا علم ہونا ضروری ہے۔

نانا ابا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''دو مسلم آبادی والی تحصیلیں بٹالہ اور گورداس پور ہندوستان کو دے کر دونوں ملکوں کے درمیان ایک دائمی مناقشت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ کیونکہ گورداس پور سے پٹھان کوٹ کے راستے ہندوستان کا ریاست کشمیر سے زمینی رابطہ کیا گیا اور یہ سب ایک گہری اور سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔''

نانا ابا ذرا خاموش ہوئے تو میں نے کہا:

''ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ کشمیر کا نیچرل الائنس پاکستان کے ساتھ ہی بنتا تھا۔''

''ہاں بالکل یہی بات ہے کیونکہ کشمیر جانے والے اس وقت گیارہ راستوں میں سے کل نو راستے پاکستان میں سے ہو کر گزرتے ہیں جبکہ صرف دو راستے ہندوستان

کے ضلع گورداس پور میں سے زبردستی نکالے گئے۔ اسی لیے گورداس پور مسلمانوں کے حوالے نہ کیا گیا۔"

"یہ تو صریحاً بے ایمانی ہے بلکہ انتہا درجے کا ظلم ہے کشمیریوں پر" میں نے قدرے جوش میں آ کر کہا۔ "اس اعلان نے تو مسلمان اکثریتی آبادی والے علاقوں میں ایک قیامت برپا کر دی ہو گی؟" میں نے بہت دکھ سے کہا تو نانا ابا بول اٹھے:

"تم ٹھیک کہتی ہو کشمیر تقسیم ہندوستان کا ادھورا ایجنڈا ہے اور اسے کسی نہ کسی روز مکمل ہونا ہی ہے...... "ان شاء اللہ" انہوں نے بڑے پر امید لہجے میں کہا۔

نانا ابا کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگے:

"دراصل قائد اعظم کو اپنی عمر کی آخری منزل میں بڑے شاطر لوگوں سے واسطہ پڑا۔"

"اکیلے قائد کس کس محاذ پر لڑتے۔ ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کے ساتھ ساتھ سکھ لیڈروں، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور ڈاکٹر نارنگ اور کئی دوسرے عناصر نے مسلمانوں کے خلاف سخت اشتعال انگیز پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔" نانا ابا ذرا دم لینے کو رُکے تو میں نے کہا:

"میرے خیال میں تو سکھوں سے بہت بڑی تاریخی غلطی ہو گئی ہے۔ ایسی ہی صورت حال کے لیے کہا گیا ہے۔

تاریخ نے قوموں کے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

نانا ابا نے میری بات کی تائید میں خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"پھر تو سخت مشکل حالات تھے قائد اعظم کے لیے؟"

"ہاں قائد پر بہت زور دیا گیا کہ وہ وزارتی مشن کے کانگریس سے منظور شدہ

منصوبے میں یا تو شریک ہو جائیں یا پھر کٹا پھٹا پاکستان قبول کر لیں۔'' نانا ابا نے کہا تو میں یکبارگی بول اٹھی:

"He really had no choice. Take it or leave it."

والا معاملہ ہو گیا تھا۔

''بالکل'' نانا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو انہوں نے جیسا کہا وہی کر دکھایا۔ یعنی کٹا پھٹا پاکستان ہی قائد کو دیا۔ کہیں سے بازو تو کہیں سے ٹانگ کاٹ دی۔ کہیں سے ہاتھ تو کہیں سے پاؤں کاٹ دیئے۔ کہیں سے ناک تو کہیں سے کان کاٹ کر رکھ دیئے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''ہاں بیٹا اب جو ہے اس سے ہی کام چلانا ہو گا۔'' نانا ابا دانش مندانہ لہجے میں میری بات کا جواب دیتے ہوئے پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

نانی ماں کافی دیر سے بڑی خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھیں...... گہری سوچ سے باہر نکلتے ہوئے انہوں نے بڑی سرد آہ بھری لیکن منہ سے کچھ نہ کہا مگر ان کی خاموشی بھی ہزار داستانیں سنا رہی تھی۔

''سونہہ گرو دی...... پاکستان زندہ باد...... سونہہ گرو دی...... سونہہ گرو دی...... سونہہ گرو دی......''

برآمدے میں راکنگ چیئر پر بیٹھے ہوئے ارشد ماموں نے اچانک ہی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

''اوئے اس حرام زادے کو کوئی چپ کراؤ۔ سونہہ گرو کا بچہ...... باز ہی نہیں آتا۔ جب دیکھو وقت بے وقت گرووں کو متھا ٹیکنے لگتا ہے۔''

نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے نانا ابا کی غصے سے بھری ہوئی آواز ابھری تو نانی ماں خاموشی سے اٹھ کر ارشد ماموں کے پاس چلی گئیں۔

ارشد ماموں اس وقت کم از کم چالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ بچپن میں دماغی چوٹ لگ جانے کے سبب وہ دنیا و مافیا سے بے خبر برآمدے میں اکثر اپنی پسندیدہ راکنگ چیئر پر پڑے جھولتے رہتے تھے اور دن میں چند مرتبہ اس قسم کے نعرے بلند کیا کرتے تھے جو ہم بچپن سے ہی سنتے آرہے تھے۔

نانی ماں بتاتی تھیں کہ بٹوارے کے وقت ارشد ماموں یہی کوئی چھ سات برس کے ہوں گے۔ ان کا مستقل ٹھکانہ تو امرتسر شہر میں ہی تھا مگر نانا ابا نے امرتسر کے نواح میں فارم ہاؤس پر بڑی آرام دہ حویلی بنوا رکھی تھی جہاں نانا ابا الٰہ آباد سے آنے پر کچھ عرصے کے لیے ضرور جایا کرتے تھے۔

وہاں کے نمبردار کرنیل سنگھ سے نانا ابا کی بڑی یاری تھی بالکل بھائیوں جیسا مان سنمان کرتے تھے۔

"امرتسر شہر اور اُس کے قرب و جوار میں اور بہت رشتہ دار مقیم تھے۔ حالات جب زیادہ خراب ہونے لگے تو بہت سے رشتہ دار اٹھ کر ہمارے ہاں آ گئے۔ تمہارے نانا الٰہ آباد میں تھے اور بڑے ماموں علی گڑھ میں تھے۔ ایسے میں ان رشتہ داروں کا بڑا سہارا تھا۔ تمہاری ماں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ لاہور میں تھیں۔" نانی اماں یادوں کی زنبیل سے قطرہ قطرہ رس ٹپکا رہی تھیں۔

"تو نانا ابا اور ماموں امرتسر کیوں نہ آئے؟" میں نے تعجب سے سوال کیا۔

"وہ ضرور آجاتے مگر انہی دنوں تمہارے نانا کو دمے کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ دمے کے دائمی مریض تھے۔ ایسی حالت میں وہ اکیلے سفر کرنے کے قابل نہ رہے تو تمہارے بڑے ماموں انہیں لینے کے لیے الٰہ آباد پہنچ گئے مگر دیکھتے ہی دیکھتے حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔"

نانی ماں کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگیں:

''ان حالات میں کرنیل سنگھ نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہم کُل ملا کر پچاس لوگ تھے۔ بلوے بڑھتے جا رہے تھے اور جان و مال بالکل غیر محفوظ ہو چکے تھے۔ ایسے میں کرنیل سنگھ نے ہم سب کو اپنی حویلی کے پچھواڑے بنے مکان میں پناہ دی۔

''بہن جی! میں اپنا دھرم نبھاؤں گا۔ آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ اگر کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو وہ ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی جائے گا۔'' کرنیل سنگھ پرعزم آواز میں کہہ رہا تھا۔

''اس نے اپنے پانچ شیر جوان بیٹے بھی ہماری حفاظت پر لگا دیئے تھے مگر پنڈ میں لوگوں کے تیور دیکھتے ہوئے ہمیں بڑی سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ہم بالکل گھر سے باہر نہ نکلیں۔ نہ بچے باہر کھیلیں نہ بولنے، ہنسنے، رونے کی آواز باہر ائے۔ کھانا پکانا، نہانا دھونا سب منع کر دیا۔ یہاں تک کہ گھر کی نالی سے پانی کی ایک بوند تک باہر گلی میں بھی آنے پر لوگوں کو وہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ مکان کو باہر سے تالہ لگا دیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہمیں کھانا اور ضروریات زندگی کی ضروری چیزیں کرنیل سنگھ پہنچا جایا کرتا تھا۔''

''بڑے مشکل حالات تھے؟'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''بس سمجھو ہم قید میں تھے۔ تین مہینے تک ہم ایسے ہی نظر بند رہے۔ تمہارے نانا اور ماموں کی کچھ خیر خبر نہیں تھی اور نہ ہی انہیں ہمارا پتہ تھا۔ ہم سخت خوفزدہ ہو چکے تھے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بس ابھی کرپانیں اور برچھیاں لے کر لوگ آتے ہی ہوں گے اور ہم سب کو ختم کر ڈالیں گے۔''

پھر ایک دن مکان کے باہر بہت سا شور سن کر ہم سب سہم گئے۔

''نکالو مُسلوں کو باہر...... ان کو ہم اپنے ہاتھوں سے ذبح کریں گے۔ حلال گوشت کھانے کا بہت شوق ہے نا ان کو۔ ہم آج ان سب کو اچھی طرح حلال

کریں گے۔''

''پنڈ میں لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ ہم وہاں چھپے ہوئے تھے اس لیے جوش جنون میں انسانوں کا بھپرا ہوا ہجوم ہماری جان کے درپے ہو رہا تھا۔ نمبردار بھی بے بس نظر آ رہا تھا۔'' نانی دور خلا میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں بہن جی، بے بس ہو گیا ہوں۔'' نمبردار کرنیل سنگھ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ یا تو آپ سب کو سکھ بنایا جائے وگرنہ وہ آپ میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہن جی مجبوری ہے۔ میں جانتا ہوں یہ بات آپ کے دھرم کے خلاف ہے مگر جان بچانے کے لیے سب جائز ہے وگرنہ یہ خودکشی کرنے والی بات ہوگی جو آپ کے مذہب میں حرام ہے۔ آپ وقتی طور پر ان کی بات مان لیں پھر دیکھا جائے گا۔''

نمبردار نے روہانسے لہجے میں کہا تو ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس مصیبت سے کیسے نپٹا جائے؟ بچنے کا کوئی راستہ نہ پا کر ہم نے اپنے رب کے حضور سجدے کر کے ہزاروں معافیاں مانگیں اور اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔

''اگلے دن مکان کا تالا کھول کر ہمیں باہر نکالا گیا اور قطار بنا کر گردوارے کی طرف لے جایا گیا۔ سارا پنڈ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا تھا۔ زبردست نعرے بازی ہو رہی تھی۔ لوگوں کو شک تھا کہ ہم دل سے سکھ مذہب قبول نہیں کر رہے بلکہ جان بچانے کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔''

''دیکھ لینا کرنیل سیہاں! ایہناں نے ساڈے دھرم وچ لت مار کے جانی آں۔'' غصے سے بھری ہوئی ایک آواز ابھری تو سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم سب کو لعن طعن کرنی شروع کر دی۔

''ہماری حالت تو ہانکے ہوئے ہرن جیسی ہو رہی تھی جو شکاری کتوں کے نرغے میں آ چکا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں زندہ سما جائیں۔ اس سے زیادہ بدنصیب منظر ان آنکھوں نے پہلے کب دیکھا تھا؟'' نانی ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔

''گرنتھی جی نے ہمیں سکھ بنانے کی ضروری کارروائی کرتے ہوئے ہمیں نئے نام دیئے اور متھا ٹیکنے کو کہا۔ میں سینے پر پنج سورہ شریف باندھ کر لے گئی تھی۔ میں نے سینے میں شدید درد کا بہانہ بنا کر کہا کہ میں زیادہ جھک نہیں سکتی۔ اس طرح متھا ٹیکنے سے میری گلوخلاصی ہوگئی۔''

''بھلا یہ سر اپنے رب کے سوا اور کسی کے سامنے کیسے سجدہ ریز ہو سکتا تھا؟'' نانی میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں تو میں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

سب کو متھا ٹیکنے کے بعد پرشاد کھلایا گیا۔ لڑکوں کو کڑے، کرپانیں اور کچھے پہنائے گئے۔ مردوں کے سروں پر خالصے کی سی پگڑی، کنگھے اور کیس سنوارے گئے۔ واہگورو کے نعرے لگوائے گئے...... واہگورو جی کا خالصہ...... واہگورو جی کی فتح، ہم گردوارے سے باہر نکلے تو ''راج کرے گا خالصہ...... باقی رہے نہ کوئی...... کے نعروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

معصوم بچوں کو کیا علم کہ کیسی قیامت گزر گئی تھی۔ وہ سب خوشی خوشی باہر کھیلنے نکل گئے۔ وہیں سے ارشد نے باقی بچوں کو دیکھ کر ''سونہہ گرو دی'' کہنا سیکھ لیا۔ رفتہ رفتہ خدا کی قسم کھانا جیسے بھول ہی گیا۔

ارشد دماغی طور پر کچھ پہلے ہی کمزور تھا جو بات اس کے دماغ میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی بس اٹھتے بیٹھتے اسے ہی دہراتا رہتا تھا۔

ایک دن سب بچے باہر کھیلتے ہوئے لڑ پڑے۔ ارشد کے منہ سے ''سونہہ گرو

دی'' کی بجائے اس دن نہ جانے کیسے ''خدا کی قسم'' نکل گیا تو سکھ لڑکوں نے اسے بہت مارا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ سکھ نہیں مُسلا تھا۔ اس مار پیٹ کے دوران ارشد پکی زمین پر گرا تو اس کے سر پر کوئی اندرونی چوٹ آ گئی جس سے اس کی دماغی حالت اور بھی مخدوش ہو گئی۔ تب سے بس یہ ایسا ہی ہے۔''

نانی ماں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

میں سوچ رہی تھی کہ ''اوئل عمر میں معصوم ذہنوں پر بننے والے نقوش مٹانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''سوونیئر شاپ سے اگر کچھ لینا ہے تو جلدی چلو وہاں رش کی وجہ سے کافی دیر ہو سکتی ہے۔''

طارق بھیا کی آواز مجھے وقت کے زینے سے اتار کر واپس واہگہ اٹاری بارڈر پر لے آئی۔

پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافت کی زبردست جھلک شاپ میں موجود سبھی چیزوں میں نظر آ رہی تھی۔ ہم سب ہر چیز کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سب بہت اشتیاق سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔

میرا دل ایک خوبصورت سی سندھی اجرک میں اٹک گیا۔

میری دلچسپی کو دیکھ کر آرمی یونیفارم میں ملبوس ایک نوجوان سیلز گرل نے شوکیس کھول کر چادر باہر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں آج ہی ڈیوٹی پر متعین ہوئی تھی اور شاپ میں بکنے والی پروڈکٹس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔

لمبائی میں بہت زیادہ اور چوڑائی میں خاصی کم اجرک نے نوجوان سیلز گرل کو مخمصے میں ڈال دیا کہ آیا یہ ایک ہی چادر تھی یا دو چادریں تھیں؟

میں بھی اجرک کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی رہنمائی کر سکتی۔

کافی دیر سے کشمکش کا شکار ناتجربہ کار سیلز گرل نے چادر کو عین درمیان سے کاٹ کر آدھی چادر میرے حوالے کر دی اور میں انجانے میں آدھی چادر لے کر شاپ سے باہر آ گئی۔

''باجی یہ تو انہوں نے آپ کو آدھی چادر دی ہے۔''

ٹیلر ماسٹر کی آواز میرے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

''آدھی چادر...... آدھی چادر......؟''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دیکھیں جی اجرک کو درمیان سے کاٹ کر اس کے دونوں حصوں کو آپس میں جوڑا جاتا ہے تاکہ چادر کی چوڑائی پوری ہو سکے۔ انہیں آپ کو پوری چادر دینی چاہیے تھی اس طرح کاٹنی نہیں چاہیے تھی یہ تو کسی نے ناسمجھی میں یا پھر جان بوجھ کر چادر کا ستیاناس کر دیا ہے۔''

ٹیلر ماسٹر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اب میں واپس واہگہ اٹاری بارڈر پر باقی آدھی چادر لینے تو نہیں جا سکتی۔''

میں نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا جی اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس آدھی چادر کے چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ بارڈر لگا کر اسے کچھ بڑا کر لیا جائے مگر یہ پھر بھی پوری چادر نہیں بنے گی۔ اسکارف سا بن جائے گا۔ بس اس سے ہی کام چلانا ہو گا۔''

ٹیلر ماسٹر نے گویا مجھے اپنے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں آدھی چادر ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور چشم تصور میں دونوں ملکوں کو جدا

کرنے والی سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی، ٹیڑھی میڑھی سرحد کی لکیر کو دیکھ رہی تھی جس نے پنجاب کے دل کو میری چادر کی طرح دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔

تاریخ کے صفحات ایک بار پھر پھڑپھڑائے۔

"آدھی چادریں...... اُدھوری چادریں...... کٹی پھٹی چادریں...... سروں سے ڈھلکی ہوئی چادریں...... خون آلود چادریں...... بین کرتی ہوئی چادریں...... وقت کی کربلا میں نیزوں پر ٹنگی ہوئی چادریں...... آدھا پاکستان...... اُدھورا پاکستان...... کٹا پھٹا پاکستان...... پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم...... گمراہ کن تقسیم...... ناقابل فہم تقسیم...... ہجرت کے دُکھ...... کشمیر کا رِستا ہوا زخم...... ہر شے ادھوری...... ہر چیز ہی نامکمل......؟"

میں نے دکھ سے سوچا تو دل نے جواب دیا:

"پنجاب کی سانجھ تو ہل پنجالیوں، چرخوں، ہانڈیوں، کنالیوں، سرسوں کے ساگ، مکئی کی روٹیوں، چاٹیوں، کاڑھنیوں، مدانیوں اور مکھن کے پیڑوں کی سانجھ ہے جو ہمیشہ ہی برقرار رہے گی۔"

دل کی خلوصِ نیت سے کہی ہوئی بات سن کر میں نے کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے آدھی چادر کھول کر سر پر اوڑھ لی۔

○

کچھ آنکھیں ہیں، کچھ سپنے ہیں، کچھ خواب ہیں بکھرے بکھرے سے
تعبیریں ڈھونڈتی خوابوں کی مجبور کہانی ایک سی ہے
(رضیہ اسماعیل)

ققنس

لزبن میں ایک ہفتے کی چھٹیاں گزار کر واپسی پر میں نے جیسے ہی اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو پورچ میں رنگ برنگے خطوں کے ڈھیر نے میرا استقبال کیا۔

''صرف ایک ہی ہفتے میں اتنی پوسٹ۔'' میں نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''اکیلے رہنے میں بس یہی قباحت ہے۔'' میں نے بیزاری سے سوچا۔

''گھر میں اگر کوئی دوسرا ہو تو کم از کم آپ کی غیر موجودگی میں پوسٹ کو اٹھا کر کہیں سلیقے سے رکھ ہی دے تا کہ تھکا ہارا بندہ ذرا دم لے کر انہیں دیکھ لے۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''آزاد اور خود مختار زندگی گزارنے کی آخر کوئی قیمت تو چکانا پڑتی ہے۔'' دل نے جیسے ٹہوکا دیا۔

دل کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے خطوں کے ڈھیر کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے سوٹ کیس اور ٹرالی کو اندر گھسیٹتے ہوئے ٹھک سے دروازہ بند کر دیا۔

سارا سامان ہال وے میں ہی چھوڑ کر میں نے کوٹ اور سکارف اتار کر ہینگر پر لٹکایا اور کچن میں جا کر کافی کا بڑا سا مگ بنا کر پورچ میں سے ساری پوسٹ اٹھا کر لونگ روم میں لے آئی۔

سارے خطوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو کئی خطوط مقامی لائبریریوں سے آئے

ہوئے تھے۔

ایک خط مڈلینڈ آرٹس کونسل اور دوسرا خط آرٹس کونسل انگلینڈ والوں کی طرف سے تھا۔

رائٹرز ویسٹ مڈلینڈ نے اپنی سہ ماہی بروشرو کے علاوہ اگلے مہینے ہونے والے برمنگھم لٹریچر فیسٹیول کی تفصیلات بھی بھیجی تھیں، Fantastic!!!

میں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔

دراصل میں نے کچھ عرصہ پہلے ہی کئی مقامی لائبریریوں اور آرٹس آرگنائزیشنز کو خطوط لکھے تھے کیونکہ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اس وقت برمنگھم شہر میں مقامی آبادی میں کس قسم کی ادبی وثقافتی سرگرمیاں ہورہی ہیں۔

میں جس تنظیم سے کافی عرصہ سے وابستہ تھی اس کی زیادہ تر ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ایشیائی کمیونٹی اور خاص طور پر پاکستانی کمیونٹی اور اردو ادب تک ہی محدود تھیں۔ جس سے یوں لگ رہا تھا کہ ہم ایک سچوریشن پوائنٹ (Saturation Point) تک پہنچ چکے ہیں اور مقامی آبادی سے الگ تھلگ ہم نے اپنی ایک دنیا آباد کررکھی ہے۔

''مقامی انگریز کمیونٹی کے ساتھ Integration بہت ضروری ہے وگرنہ ہم زیادہ دنوں تک Survive کرتے نظر نہیں آتے۔''

میں نے پراجیکٹ منیجر کو تنظیم کے مستقبل کے بارے میں گویا پیشگی وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' میری بات غور سے سنتے ہوئے پراجیکٹ منیجر نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں تو مقامی ادبی تنظیموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد ان سے ذاتی رابطے کرکے کچھ ایسے ادبی پراجیکٹ شروع کیے جائیں

جن سے انہیں ہمارے ادبی ورثے سے آگاہی ہو اور ہم ان کے ادب کو اپنی کمیونٹی میں متعارف کروائیں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’خیال تو اچھا ہے مگر کافی بڑا پراجیکٹ ہے اور پھر ہماری کمیونٹی میں سب ہی لوگ تو انگریزی زبان اتنی اچھی طرح نہیں سمجھتے کہ انگریزی ادبی ورثے سے پوری طرح حظ اٹھا سکیں۔‘‘ پراجیکٹ منیجر نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

’’اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ اردو زبان میں ترجمے کر کے ہم انگریزی ادب کو اپنی کمیونٹی میں متعارف کروا سکتے ہیں مگر کہیں سے کام کا آغاز تو ہو۔‘‘ میں نے کہا ’’ون تھنگ ایٹ اے ٹائم۔‘‘

’’تو ٹھیک ہے پھر لٹریچر آفیسر کی حیثیت سے تم مقامی ادبی و ثقافتی تنظیموں سے رابطوں کا آغاز کرو۔‘‘ پراجیکٹ منیجر نے گویا اپروول (Approval) دیتے ہوئے کہا۔

یہ گفتگو کوئی ایک ہفتہ قبل ہی ہمارے درمیان ہوئی تھی اور اتنے سارے رنگ برنگے خطوں کا ڈھیر دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ تعلیم یافتوں معاشروں میں سینس آف ریسپونسیبلٹی (Sense of Responsibility) کی داد دینی پڑے گی۔ کچھ بھی ہو یہ لوگ آپ کے خط کا جواب ضرور دیں گے چاہے جواب نفی میں ہی ہو اور ایک ہمارے ہاں دیکھو اگر کسی نے بھولے بھٹکے سے کسی ادارے کو خط لکھ ہی دیا تو خط کو دبا کر ہی بیٹھ جائیں گے اور جواب دینے میں بھی اپنی ہتک محسوس کریں گے۔

بہت سی جنک میل بھی تھی جسے میں نے ری سائیکلنگ (Recycling) کے لیے الگ کر لیا۔

میں ایک ایک کر کے خط کھولتی جا رہی تھی اور مقامی ادبی منظر نامہ آشکارا ہوتا جا رہا تھا۔

برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآوٹ بارڈرز'' (Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔

''ویسپرز ان دی وال'' (Whispers in the Wall) کتابچے میں نئے لکھنے والوں کی شعری تحریریں تھیں جن میں مختلف کمیونٹی کے لوگ شامل تھے۔ ان میں انگریزوں کے علاوہ جمیکن، افریقن، انڈین، پاکستانی اور بنگلہ دیشی رائٹرز تھے مگر زیادہ تر لکھنے والی خواتین تھیں۔

''رائٹ آف وے'' (Right of Way) میں ایشیائی خواتین کی ادبی ورکشاپوں کے نتیجے میں لکھی جانے والی شعری اور نثری تحریروں کو یکجا کر کے اس کی اینتھالوجی (Anthology) شائع کی گئی تھی۔

کافی عرصہ پہلے برٹش ساؤتھ ایشین رائٹرز کی شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔اس کی فوٹو کاپی منسلک تھی۔

ینگ ایشین وویمن رائٹرز کی شعری اور نثری تحریروں کا مجموعہ ''رائٹ ٹریک'' (Write Track) ساؤتھ یارڈلے لائبریری نے ارسال کیا تھا۔

سیفرون ٹی (Saffron Tea) ایشیائی رائٹرز کی شاعری کا ایک اور مجموعہ کسی نے ارسال کیا تھا مگر نام پتہ لکھنا بھول گئے تھے۔

اس کے علاوہ کئی ادبی گروپوں کی تفصیل تھی جو باقاعدگی سے شہر میں مختلف جگہوں پر ملنے کا اہتمام کرتے تھے جس میں ''پوئٹس پلیس'' (Poets Place) کے علاوہ ''کینن ہل رائٹرز گروپ'' (Cannonhill Writer Group) اور ''کینن پوئٹس'' (Cannon Poets) شامل تھے۔''ویری گڈ اسٹارٹ'' میں نے بڑے پرامید لہجے

میں کہا۔

اگلا کتابچہ ''دی سی ان برمنگھم'' (The Sea in Birmingham) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ''عجیب سا نام ہے'' میں نے سوچا۔

برمنگھم میں تو دور دور تک کسی سمندر کا گزر نہیں ہے تو یہ کس سمندر کا ذکر خیر ہے۔ سب سے قریبی ساحل سمندر بھی کم از کم 105 میل کے فاصلے پر ویسٹرن سپرمیر (Westron Supermare) ہے۔

کتابچہ پڑھنے پر پتہ چلا کہ یہ برمنگھم کے شارٹ سٹوری رائٹرز کا سمندر تھا جن کی تحریریں ٹنڈل سٹریٹ فکشن گروپ (Tindal Street Fiction Group) نے شائع کی تھیں۔

''ویری انٹرسٹنگ'' میں نے کتابچہ اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

چند ایک نام تو جانے پہچانے سے لگ رہے تھے جن میں گینر آرنلڈ (Gaynor Arnold) کا نام سرفہرست تھا۔ اس کا پہلا ناول The Girl in Blue کے نام سے کچھ عرصہ پہلے ہی شائع ہوا تھا اور مین بکر پرائز کی لونگ لسٹ میں آ گیا تھا جس سے اُسے کافی پبلسٹی مل رہی تھی کیونکہ مین بکر پرائز برطانیہ میں ادب کا بہت Prestigious انعام خیال کیا جاتا ہے۔

برمنگھم لٹریچر فیسٹیول کا انعقاد اکتوبر میں پورے ایک ہفتے کے لیے ہو رہا تھا۔ کافی بھاری بھرکم بروشر تھا جس میں جوناتھن ڈیوڈسن کا نام بطور چیف ایگزیکٹو دیکھ کر میں مسکرا پڑی۔

جوناتھن کو میں اس وقت سے جانتی تھی جب وہ سنٹرل لائبریری میں لٹریچر آفیسر ہوا کرتا تھا۔ یہ کم و بیش پندرہ برس پرانی بات تھی جب میں نے ادبی و ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کے ساتھ بطور لٹریچر آفیسر کام شروع کیا تھا۔

''آ گہی'' ایک نئی ثقافتی تنظیم تھی بہت سے Teething Problems کے علاوہ فنڈز کی بھی شدید قلت تھی۔ جس کی وجہ سے تقریبات کے لیے ہم کوئی مناسب جگہ کرائے پر لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ایسے کڑے وقت میں جوناتھن نے ہماری بہت مدد کی تھی اور ہمیں لائبریری کا وسیع و عریض تھیٹر ہال کافی مرتبہ بغیر کوئی کرایہ چارج کیے ہوئے استعمال کے لیے دیا تھا۔

اگر کبھی بڑے ہال میں کوئی اور تقریب ہو رہی ہوتی تو وہ ہمیں شیکسپیئر میموریل روم کھول دیا کرتا تھا جو اکثر چھوٹی تقریبات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

''اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی پائے جاتے ہیں لیکن ہم جب بھی انگریزوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو انہیں صرف پولیٹیکل اینگل سے ہی دیکھتے ہیں وگرنہ معاشرتی نقطۂ نظر سے تو میں نے انہیں اپنے لوگوں سے زیادہ انسان دوست اور انسانی قدروں کا احترام کرنے والا پایا ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں جیسے ایک بار پھر جوناتھن کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ہفتہ تک جاری رہنے والا برمنگھم لٹریچر فیسٹیول خاصا دل چسپ اور Ethnically Diverse لگ رہا تھا۔ مجھے قوی اُمید تھی کہ اس میں شرکت کرنے سے بہت سی ادبی تنظیموں سے رابطے استوار کرنے میں مدد مل سکتی تھی کیونکہ فیسٹیول میں ہر رنگ اور نسل کے لکھنے والے لوکل، نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر اپنے اپنے ادب کی نمائندگی کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

"What a city! Full of art and culture."

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط

وضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس سال لٹریچر فیسٹیول کی تھیم (Theme) میں کافی ندرت تھی۔

"Relationship between the written word and music."

یعنی کہ ''الفاظ اور موسیقی کا ملاپ''

ان دونوں آرٹ فارمز کے علاوہ شاعری اور ناول کی ڈانس، تھیٹر اور فلم کے ذریعے پرفارمنس کے کئی پروگرام تھے۔

جس میں جنگ کے موضوع پر پچھلے سو سالوں میں لکھی جانے والی شاعری کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔

بہت مختصر کہانی (Very Short Story) کو صرف سات منٹوں میں ڈرامائی انداز میں سنانا تھا۔

امریکہ سے مشہور شاعرہ Rita Dove شریک ہو رہی تھی۔

لیٹویا اور لتھونیا جیسے ممالک سے ناول نگار اور شاعرات اپنے اپنے ناول اور شاعری کو انگریزی تراجم کے ساتھ پیش کرنے کے لیے آ رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ اردو ادب کے تراجم ایسے پلیٹ فارم سے پیش کرنے کا خیال ہمیں کیوں نہیں آتا؟

اس کے علاوہ شاعری پر ایک فلم "Moving Images" کے نام سے دکھائی جا رہی تھی۔

ایک ورکشاپ طنزیہ اور طربیہ تحریروں کے بارے میں تھی۔

کرائم لٹریچر اور ٹی وی سکرپٹ رائٹنگ "Page to Screen" کی دو ورکشاپس تھیں۔

بچوں کے ادب پر کافی بھرپور پروگرام تھا۔

شاعری کے دو مقابلے منعقد ہو رہے تھے۔ ایک تو "Come Write with me" تھا جبکہ دوسرا کافی خوفزدہ کر دینے والا مقابلہ تھا جس میں شاعری سے دل چسپی رکھنے والے کل 20 افراد کو دو نامور شاعروں کے ساتھ مُردوں کے لیے تابوت تیار کرنے والی ایک بہت مشہور فرم کی فیکٹری میں تمام رات جاگ کر گزارنی تھی اور اس کے نتیجے میں جو بھی جذبات و احساسات، مشاہدات اور تجربات ہوتے انہیں شعر کا جامہ پہنانا تھا...... خاصا دل گردے کا کام تھا۔ میرے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

یہ فیکٹری ایک ایسی ویران جگہ پہ تھی جہاں اندھیرا ہو جانے کے بعد بہت کم لوگ جانے کا تصور کر سکتے تھے کیونکہ بھوت، پریت اور روحوں بدروحوں کی کئی کہانیاں اس جگہ سے منسوب تھیں۔

بہت اعلیٰ قسم کے تابوت تیار کرنے کے علاوہ اس فرم کی وجۂ شہرت برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل اور مادر ملکہ کے تابوت تیار کرنے کے لیے سامان فراہم کرنا بھی تھی۔

اس مقابلے کے بارے میں پڑھ کر میں کافی دیر تک لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب کے بارے میں سوچتی رہی جہاں ہمارے بہت سے مشاہیر اور خاص طور پر ادبی شخصیات مدفون ہیں۔ شاعری کا مقابلہ اگر وہاں منعقد کروایا جائے تو کیسا رہے؟

مہاتما گاندھی پر ساؤتھ ایشین آرٹس جسے میرے خیال میں انڈین آرٹس کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کے زیادہ تر پروگرام انڈیا اور انڈین آرٹس پر ہی ہوتے تھے، انہوں نے ایک شعری مقابلہ منعقد کروایا تھا اور اب اس فیسٹیول میں جیتنے والی نظمیں پیش کی جانی تھیں۔

میرا دھیان اب کی بار بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی طرف چلا گیا۔
''ہم نے بیرون ملک تو درکنار کیا کبھی اپنے ملک میں بھی مل گیر سطح پر ان کے لیے کسی ایسے ایونٹ کا اقدام کیا ہے؟''

جو ورکشاپس مجھے سب سے زیادہ دل چسپ لگیں ان میں ایک تو خانہ بدوشوں کے گیتوں (Gypsy Songs) کے بارے میں تھی جس میں رومانیہ، سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ سے خانہ بدوشوں کے روایتی گیت شامل کیے گئے تھے۔

خیال رہے کہ یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں خانہ بدوشوں کو اب زیادہ مہذب نام سے بلایا جاتا ہے یعنی ٹریولنگ فیملیز (Travelling Families)۔

اردو اور پنجابی لوریوں اور نظموں پر ایک ورکشاپ ہو رہی تھی۔ آکسفورڈ کی مشہور پاکستانی پنجابی شاعرہ، ادیبہ اور گلوکارہ نے اپنی آواز میں پنجابی اور اردو لوریاں اور نظمیں ریکارڈ کروائی تھیں جس کی سی ڈی اس فیسٹیول میں لانچ کی جا رہی تھی۔

مجھے اس ورکشاپ کے بارے میں پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ چلو کہیں سے ابتدا تو ہوئی اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اس کے علاوہ بھی چند اور ایشین رائٹرز اس فیسٹیول میں شرکت کر رہے تھے

جن میں بطور خاص کافی مشہور ٹی وی کامیڈی اداکار اور رائٹر میرا سیال اپنے بیسٹ سیلر ناول (Anita and Me) کی ڈرامائی تشکیل لے کر تنیکہ گپتا کے ساتھ آ رہی تھیں۔ میرا نے بہت اچھے ناول اور کہانیاں لکھی تھیں جن میں Life is not all Ha Ha He He اور Bhaji on the Beach بہت مشہور ہوئے تھے۔

ست نام سانگھرا اپنے ناول میرج میٹیریل (Marriage Material) کے بارے میں بات چیت کرنے والا تھا کہ کس طرح دوسروں کی تخلیقی تحریریں آپ کو انسپائر کرتی ہیں اور آپ کے اپنے تخلیقی عمل میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

رائٹنگ ہوم (Writing Home) ورکشاپ کافی الگ قسم کی تھی جسے مختلف نسلی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے رائٹرز نے ترتیب دیا تھا جن کا تعلق برطانیہ، پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش، پولینڈ، سپین، اٹلی اور صومالیہ کے علاوہ ترکی سے تھا۔

یہ کری ایٹو رائٹنگ (Creative Writing) کی دو ورکشاپس خاص طور پر کہانی کے حوالے سے منعقد ہو رہی تھیں۔

لٹریچر فیسٹیول کی تھیم کے مطابق کہانی کو لفظوں کے علاوہ دیگر آرٹ فارمز میں بھی Explore کیا جانا تھا جن میں مصوری اور سنگ تراشی خاص طور پر شامل تھے جبکہ دوسری ورکشاپ صرف سٹوری ان ورڈز (Story in Words) کے بارے میں تھیں۔

میں نے اسی ورکشاپ کے لیے تنظیم کے چند ممبران اور اپنے لیے بکنگ کروا دی کیونکہ میرے خیال میں یہاں ہمیں کچھ اچھے کنٹیکٹ مل سکتے تھے۔

ورکشاپ کے روز ادھیڑ عمر انگریز رائٹر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

''کہانی زندگی سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کہانی سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کہانی کے

پردے میں زندگی دھڑکتی ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا کیونکہ زندگی کی کوکھ سے ہی تو کہانی جنم لیتی ہے۔"

ورکشاپ کے لیے آئے ہوئے مندوبین میں تقریباً ہر رنگ اور نسل کے لوگ موجود تھے جن میں انگریز، پولش، جمیکن، افریقن اور ایشین مرد اور عورتیں کافی تعداد میں تھے اور بڑے انہماک سے اس کی بات سن رہے تھے۔

انڈین رائٹر نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو سبھی پرفارمنگ آرٹس میں زندگی دل بن کر دھڑکتی ہے۔ رقاص کے تھرکتے ہوئے پاؤں ہوں یا موسیقی کی مدھر تانیں۔ سنگ تراش کا خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتا ہوا مجسمہ ہو یا مصور کے برش سے کینوس پر بنی ہوئی رنگولی۔ تخیل کی اڑان ہو یا لفظوں کا اعجاز۔ سب تخلیقی جواہر پاروں میں زندگی ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔"

"زندگی، کہانی اور تخلیق" کے تعلق پر غور کرتے ہوئے میرا وجدان دور اُفق کے اس پار جا پہنچا جہاں چپے چپے پر کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔

لفظ "کُن" کی کہانی جس کے کہنے پر ساری کائنات عدم سے وجود میں آ گئی تھی...... سب سے اول پیدا کیے جانے والے نورِ محمدی ﷺ کی کہانی جسے عظیم تخلیق کار نے اپنے ہاتھوں سے چار حصوں میں بانٹ کر ان سے عرش، قلم، بہشت اور عالم ارواح اور باقی ساری مخلوق کو پیدا کیا، پھر قلم کے ساق عرش پر اوّل کلمہ لکھنے کی کہانی، اور ہیبت خطاب جلِ شانہ سے قلم کے منہ پر شگاف ہونا جو قیامت تک کے لیے جاری ہوا۔ شجر ممنوعہ کی کہانی اور آدم وحوا کی نافرمانی کی داستان۔

کہیں بہت دور سے آواز آئی "قلم کے سینہ پرسوز میں وقت کی امانتیں دفن ہوتی ہیں اور جن چنیدہ لوگوں پر تخلیق کی عطائے خاص ہوتی ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ

وہ پوری فکری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ ان امانتوں کو اپنے اپنے عہد کے سپرد کر دیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے کچھ بے یقینی سے سوال کیا تو جواب آیا:

"ہر تحریر اپنے اپنے عہد کی عکاس ہوتی ہے۔ ایک قلم کار کا وجدان، اُس کا تخیل، اُس کا مشاہدہ، اُس کا تجربہ اور علم و آگہی اس کے عہد کی تہذیب و معاشرت کو کہانی بنا کر کاغذ کے زندان میں قید کر سکتا ہے۔"

مگر زمینی سچائیاں ایک قلم کار کے فکر و نظر کو متاثر کرتی ہیں اور شاید وہ پورا سچ بیان کرنے سے قاصر ہو؟

میرا چہرہ سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

"تمہاری بات بھی ایک حد تک درست ہے مگر آدھا سچ پورے سچ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ قلم کار کی فکری بددیانتی سے کہانیاں زخمی ہو سکتی ہیں اور......"

میں بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی بول پڑی۔

"زخمی کہانیاں تو بہت خطرناک ہو جاتی ہوں گی؟"

"ہاں، بالکل زخمی ناگن کی طرح...... یہ آدھی ادھوری کہانیاں بہت شوریدہ سر ہو جاتی ہیں۔ ان کی آنکھ کی پتلی میں انہیں زخمی کرنے والے کی شبیہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر کہیں دور سے سنائی دینے والی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔

اس کے ساتھ ہی ورکشاپ میں پاکستانی رائٹر کی آواز گونجی جو مندوبین سے چھوٹے چھوٹے گروپس میں اپنی اپنی زبان کے ادب میں کہانی کے ارتقاء پر تبادلہ خیالات کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

پاکستانی مندوبین کے گروپ میں اردو کہانی کے ارتقاء پر بات چیت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ''1970 کے بعد سے اردو کہانی میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہماری کہانی کا روایتی کہانی اور اساطیری کہانی سے لے کر جدیدیت پھر مابعد جدیدیت تک کا سفر...... پھر تجریدیت کا تجربہ...... سرایلزم یعنی خوفناک علامتوں کا استعمال پھر علامتی کہانی......'' میں نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ایک خاتون نے لقمہ دیا۔

''ارے علامتی کہانیاں وہی ناں جن میں گھوڑوں، گدھوں، سانپوں، چھپکلیوں اور الوؤں کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ توبہ ہے۔'' خاتون نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اب زندگی کو بیان کرنے کے لیے اظہار کے یہ طریقے اپنائے جائیں گے؟

''ایکسپیریمنٹ، ایکسپیریمنٹ'' ...... ایک مندوب نے جواب دیا۔

''تجربہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے مگر علامتی کہانی کا ترجمہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا؟'' ایک مندوب نے کہا۔

''سوتو ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''بھئی ترقی پسند کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ایک آواز اُبھری۔

''کہانی تو ہمیشہ ترقی پسند ہی ہوتی ہے'' دوسری آواز نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' پہلے مندوب نے سوال کیا۔

''اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ ہر قلم کار اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے تو پھر ہر عہد آنے والے عہد سے اگر اخلاقی قدروں کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم مادی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے تو پھر کہانی ترقی پسند ہوگئی ناں۔''

اس مندوب کی انوکھی منطق سُن کر ایک زبردست قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

ایک اور خاتون کہنے لگیں ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ منٹو نے کہا ہے کہ ''میں

زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا ہی اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا ویسا ہی اظہار کرتا ہوں'' یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟''

یہ بات کہتے ہوئے خاتون نے سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''کیا واقعی منٹو نے یہ بات کہی ہے یا اس سے غلط طور پر منسوب کی جا رہی ہے؟'' سب کو خاموش پا کر خاتون نے پھر سوال کیا۔

سبھی مندوبین ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر کچھ سوچتے ہوئے ایک خاتون بولیں ''میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر آپ منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' یا ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھیں تو کیا وہ زندگی کو اس رنگ میں دیکھنے کا متمنی تھا جس میں عورت کی اس طرح سے تذلیل کی جائے؟''

''یہ بات دل کو نہیں لگتی!'' دوسری عورت بول اٹھی۔

ابھی ہماری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ورکشاپ میں پھر انگریز رائٹر کی آواز گونجنے لگی ''لندن کے بعد'' ویسٹ مڈلینڈ برطانیہ کی دوسری سب سے بڑی ریجن ہے جہاں سب سے زیادہ کثیر النسل لوگوں کا ارتکاز ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں کے ادب کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں جو ہمارے عہد اور ہمارے معاشرے کی تشکیل میں شامل ہیں۔''

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اس ملک میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والی کتابوں میں صرف چار فیصد کتابیں دوسری زبانوں کے ادب سے ترجمہ ہو کر آتی ہیں اور وہ بھی صرف چند ممالک سے۔ اس وقت ہمارے پاس دوسرے کلچرز کا ادب پڑھنے اور یہاں ہجرت کر کے آنے والے رائٹرز کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع بہت محدود ہیں۔''

اتنا کہہ کر انگریز رائٹر ہمارا ردعمل جاننے کے لیے خاموش ہو گیا۔

''کافی معلومات افزا بات کہی ہے آپ نے تراجم کے بارے میں۔'' ایک مندوب نے کہا۔

''مگر میری ایک ریزویشن ہے ترجموں کے بارے میں کہ ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر شاعری میں بہت سا پوئٹک امپریشن دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اور یوں کافی کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔'' دوسرے مندوب نے جواب دیا۔

''ہاں مگر یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ترجمہ کرنے والے کی گرفت دونوں زبانوں پر کتنی مضبوط ہے اور پھر شاعری کے ترجمے کے لیے مترجم میں Poetic sensibility and senstivity کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

ایک مندوب نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ ترجمہ کرنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے کیونکہ دوسروں تک اپنا ادبی ورثہ پہنچانے میں ایک ذہنی تعلق (Intellectual Relationship) کے ساتھ ساتھ ثقافتی ہم آہنگی (Cultural Harmony) بھی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری تنظیم خود اس پراجیکٹ پر کام شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ وگرنہ تو ہم کبھی بھی ادبی اور ثقافتی حوالوں سے اس معاشرے میں Integrate نہیں ہو سکتے۔

میں نے تراجم کے حق میں گویا بھرپور دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بات مکمل ہو گئی ہو تو ذرا آگے بڑھیں۔'' اب کی بار پولش رائٹر کی آواز روسٹرم سے گونجی۔

''دراصل زندگی اور کہانی کے درمیان ایک بہت باریک سا پردہ ہے۔ جس طرح زندگی کے راستے اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی کہانی چلتے چلتے کوئی موڑ مڑ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ اب آگے سرسبز و شاداب نخلستان ہوگا؟ یالق ودق صحرا آئے گا؟

ہم سب اس کی بات بہت دل چسپی سے سن رہے تھے۔ ایک مندوب کہنے لگا:

''آپ کا کہنے کا مطلب ہے کہ جس طرح ندی میں اٹھنے والی لہر کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے راستے میں کتنے پڑاؤ آئیں گے اس طرح زندگی کی کہانیاں بھی ندی کی لہروں کی مانند ہی ہوتی ہیں۔ کہانی کے آغاز میں جو لگتا ہے اس کے برعکس انجام کچھ اور ہی نکلے۔''

"Exactly" اب کی بار پاکستانی رائٹر نے مندوب کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''جس طرح زندگی کبھی کبھار چونکا دیتی ہے کہانی کا انجام بھی چونکا دینے والا ہوتو پڑھنے والے کے لیے سوچ کی ایک روشن لکیر چھوڑ جاتا ہے اور یہی ایک اچھی کہانی کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔''

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں...... موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں...... بین کرتی ہوئی کہانیاں...... روٹھی ہوئی کہانیاں...... ہاری ہوئی کہانیاں...... مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں...... کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!'' اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔

بعینہ جیسے کسی نے کہا ہے کہ ''عورت محبت کی وہ کہانی ہے کہ جب اختتام کو پہنچتی ہے تو ایک نیا آغاز پاتی ہے۔'' میں نے منہ ہی منہ میں بُدبداتے ہوئے کہا۔

''اُدھوری کہانیوں میں بانسری کی سریلی تانوں کے ساتھ ساتھ پنچم کے سُروں میں محبتوں کی گنگناہٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ جیسے ساربان پیار سے تھپکی دے تو اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں بھی محبت کے الوہی گیت الاپنے لگیں۔''

ایک مندوب نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑی اداس سی آواز میں کہا تو دوسرے مندوب نے پرتفنن انداز میں اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا:

''اویار بس کرو کہتے ہیں دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور مجھے ابھی موٹروے پر کئی میل کا سفر کر کے گھر واپس بھی جانا ہے۔'' مندوب کی بات سن کر فلک شگاف قہقہہ پڑا۔

''خاصا دل چسپ موضوع ہے ادھوری کہانیاں؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے سلیم کوثر کی نظم ''چھاؤں'' یاد آ گئی۔

''کہانی اور محبت میں ازل سے جنگ جاری ہے
محبت میں اک ایسا موڑ آتا ہے
جہاں آ کر کہانی ہار جاتی ہے
کہانی میں تو کچھ کردار ہم خود فرض کرتے ہیں
محبت میں کوئی کردار بھی فرضی نہیں ہوتا
کہانی کو کئی کردار
مل جل کر کہیں آگے چلاتے ہیں
محبت اپنے کرداروں کو خود آگے بڑھاتی ہے
کہانی میں کئی کردار
زندہ ہی نہیں رہتے
محبت اپنے کرداروں کو مرنے ہی نہیں دیتی

کہانی کے سفر میں

منظروں کی دُھول اڑتی ہے

محبت کی مسافت راہ گیروں کو بکھرنے ہی نہیں دیتی''

میں اپنے خیالوں میں کہیں بہت دور نکل گئی تھی۔ ایک مندوب کی آواز سن کر واپس لوٹی۔

''ہر زبان کے ادب میں محبت کی ادھوری کہانیوں کا ذکر ملتا ہے جیسے ہمارے ہاں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں اور مرزا صاحباں کی لوک داستانیں ہیں۔ اس کے علاوہ رومیو جولیٹ، اینٹونی قلوپطرہ، شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں ابھی تک سسک رہی ہیں۔'' ایک پاکستانی مندوب نے کہا۔

''کہانی کبھی نہیں مرتی چاہے وہ ادھوری ہی کیوں نہ رہ جائے۔'' میں نے کچھ سوچ کر قدرے اداسی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ادھوری محبتیں ہی تو اصل کہانی بناتی ہیں وگرنہ مکمل ہو جانے والی محبتوں کو کون یاد رکھتا ہے؟'' میری بات سن کر ایک اور مندوب نے گویا فلسفے کی گتھی سلجھاتے ہوئے کہا:

''سوال تو صرف راستے میں رہ جانے والوں سے کیے جاتے ہیں منزل پر پہنچ جانے والوں سے نہیں۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔

اب کی بار اٹیلین رائٹر بول رہا تھا ''اس کائنات کا ذرہ ذرہ ایک کہانی سنا رہا ہے۔ ہمارے وجود کے چودہ کھرب خلیے بھی کئی کہانیاں سنا رہے ہیں۔'' ایک مندوب جلدی سے بول اٹھا۔

''ونڈر فل...... کیا بلین ڈالر کی بات کی ہے آپ نے......''

میں سوچ رہی تھی کہ ''اگر کہانی کبھی مکمل ہی نہیں ہوتی تو پھر بہترین سے بہترین کہانی کار بھی کبھی پوری کہانی بیان نہیں کرسکتا؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو'' وقت نے جیسے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

حقیقت کو کہانی بنا کر من وعین بیان کر دینا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ چیزوں کو دیکھنے کے لیے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ لینز ہوتا ہے جس سے ان کا اپنا اپنا سچ اور اپنی اپنی کہانی وجود میں آتی ہے۔''

''تو پھر سارتر، کامیو، والٹیر، بالزک، موپساں، ٹالسٹائی، گورکی، دوستوفسکی، چیخوف، پشکن، گوگول، جیمز جوائس اور فرانز کافکا سبھی کی بات کیا ادھوری ہی تھی؟''

میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''قانون فطرت ہے کہ مادے کو کبھی فنا نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ مختلف شکلیں بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا رہتا ہے جس طرح سے مادے کی ری سائیکلنگ جاری ہے اسی طرح کہانی نئے نئے چولے پہن کر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔'' وقت نے جواب دیا۔

''ہوں'' میں نے الجھے الجھے سے لہجے میں کہا۔

''تو کیا سعدی، خلیل جبران، کرشن چندر، منٹو، پریم چند، ٹیگور، قراۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، خواجہ احمد عباس، عبداللہ حسین اور انتظار حسین کے علاوہ دنیا کے اور بہت سے کہانی کاروں کی کہانیاں نامکمل ہی رہ گئی؟''

''بالکل'' اب کی بار دل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''زندگی اور کہانی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اگر زندگی نامکمل ہے اور ہر لمحہ تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے تو پھر کہانی بھی نامکمل ہی رہے گی نا؟''

دل کی بات سنتے ہی میرا خیال اقبال کے اس شعر کی طرف چلا گیا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے۔کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے...... ہاں اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں...... میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو...... اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے...... میں اسی لیے جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کرلوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے......''

''گروپ ڈسکشن کا وقت ختم ہو گیا ہے اور اب ورکشاپ اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔''

جیسے ہی ہال میں ٹرکش رائٹر کی آواز گونجی تو سبھی مندوبین اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ققنس اور کہانی میں ایک گہری مماثلت ہے۔یونانی فیمیات کے مطابق ققنس کے پروں کو لگنے والی آگ اس کے اندر سے ہی اٹھتی ہے۔اس طرح جب ایک ققنس اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تو اس کی خاک سے ایک نیا ققنس جنم لیتا ہے۔''

سبھی مندوبین بہت غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''اسی طرح کہانی میں ایک رشتہ، ایک تعلق ختم ہونے پر کوئی دوسرا رشتہ، کوئی نیا تعلق اسی کہانی کی راکھ سے جنم لیتا ہے۔''

کہانی اور ققنس کی مماثلت ایک فکر انگیز بات تھی جسے سُن کر سبھی مندوبین جیسے

سوچ میں پڑ گئے۔ ٹرکش رائٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''چونکہ پوری کہانی کبھی بھی لکھی نہیں جا سکتی اس لیے بظاہر مکمل ہو جانے والی کہانی بھی ایک اور کہانی کو جنم دیتی ہے۔ یوں کہانی در کہانی کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ یعنی ایک کہانی کی خاک سے ہر بار نئی کہانی پیدا ہو جائے گی قُقنس کی طرح۔''

اب کی بار پاکستانی رائٹر کی آواز سنائی دی۔

''اپنے ہی خاکستر سے بار بار جنم لیتے رہنے میں ہی کہانی کا حسن پنہاں ہے۔ یہی اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔''

ہال میں بیٹھے ہوئے سبھی مندوبین ققنس اور کہانی کے اس انوکھے تعلق پر ستائش بھرے انداز میں مسکرا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا سفر
بجھا چراغ تو دل کو جلا لیا میں نے

ادبی اور تخلیقی سفر

شاعری

- ☆ گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں) ۲۰۰۰ء
- ☆ سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں) ۲۰۰۰ء
- ☆ میں عورت ہوں (نظمیں مع انگریزی ترجمہ) ۲۰۰۱ء
- ☆ پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے) ۲۰۰۱ء
- ☆ ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں، دوہے) ۲۰۱۱ء
- ☆ خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات) ۲۰۱۲ء
- ☆ خوشبو اُڑتی پھرے (دوہے) ۲۰۱۶ء
- ☆ احساس کی خوشبو (نظمیں مع انگریزی ترجمہ) ۲۰۱۶ء

نثر

- ☆ چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح) ۲۰۰۰ء
- ☆ کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں) ۲۰۱۲ء
- ☆ آدھی چادر (افسانے) ۲۰۱۶ء

زیرِ طبع

- ☆ مٹی کی آواز (افسانے)
- ☆ دائروں کا سفر (افسانچے)
- ☆ اجالوں کے استعارے (یادنگاری)

تالیفات

- ☆ نذرانۂ عقیدت ......مجموعۂ درود شریف ۱۹۹۷ء
- ☆ نیشنل ویمن ڈائریکٹری ۱۹۹۹ء

  (برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز)...... بہ اہتمام ''آ گہی''
- ☆ رائٹ ٹریک (Write Track) ۲۰۰۰ء

  (''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)
- ☆ پوئٹری ٹائم (Poetry Time) ۲۰۰۰ء

  (''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)
- ☆ قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب) ۲۰۰۲ء
- ☆ ''آ گہی'' ویب سائٹ کا اجراء ۱۹۹۹ء

  www.aaghee.co.uk

رابطہ: 10 Augusta Road
Acocks Green
Birmingham
B27 6LA
England.(UK)

ٹیلی فون: +44 0121 574-5148

موبائل: 0750 764 6659

ای میل: aaghee@hotmail.com